عظیم بیگ
چغتائی

سوائز کی روحیں

مرزا عظیم بیگ چغتائی

comp.

عنوان

Cata

سوانہ کی رُوحیں

سرزمین مارواڑ کی ایک انتہا سے زیادہ دلدوز اور غمناک ٹریجڈی
کے پُر اسرار حالات

یعنی

راٹھوروں کا خنگی بانکپن! راجپوت کماریوں کی جرأت کے کارنامے اُن کے حسن و
جمال کی رعنائیاں اور فسونِ محبت کی دلکش سحرکاریاں۔ رزم بزم کی ہوشربا
داستان جگرپاش اور جانگسل واقعات۔ حسن و عشق کی خونین داستان۔
ایک خوفناک اور دل ہلا دینے والی دلدوز ٹریجڈی۔ ایک ظرافت نگار کے قلم سے

مُصنّفہ
مرزا عظیم بیگ چغتائی بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی (علیگ)

ملنے کا پتہ نظامی بک ایجنسی بدایوں (یو۔ پی)

(مطبوعہ نظامی پریس بدایوں)

پیش لفظ

"سوانہ کی روحیں" چغتائی صاحب کا بے مثل شہ پارہ ہے۔ ستمبر ۳۵ء میں میں اُن سے ملنے جودھپور گیا تھا جہاں کی تواضع انہوں نے اس طرح کی کہ پے در پے کئی مضمون ساقی کیلئے لکھ ڈالے۔ مجھے روکنے کی انہیں یہ انوکھی ترکیب سوجھی کہ رات کو کسی کہانی کا پلاٹ سُناتے اور پھر کہتے کہ ایک دن اور رُک جاؤ تو یہ کہانی اور لکھ دیں۔ غرض میرے ایک ہفتہ کے دوران قیام ہی میں انہوں نے دس بارہ نہایت عمدہ افسانے مجھے لکھ کر دیدیئے۔ یہیں سے مجھے "چغتائی نمبر" کی اشاعت کا خیال آیا جو چند اور مضامین کے اضافہ کے ساتھ یکم اکتوبر ۳۵ء کو شائع ہوا۔ "سوانہ کی روحیں" چغتائی صاحب کے تخیلی مضامین کا سب سے اچھا نمونہ ہے دوسری بات یہ دیکھنے کی ہے کہ چغتائی صاحب مشہور ظرافت نگار تھے لیکن جب ٹریجڈی لکھتے تھے تو اتنی موثر کہ آنسو رک نہیں سکتے تھے "سوانہ کی روحیں" مرزا صاحب کی حزن نگاری کا شاہکار ہے۔ کہانی اتنی دلکش ہے کہ غالباً اُن کی کوئی کہانی اتنی دلکش نہیں۔ مارواڑ کے رزم و بزم کے واقعات اور اُن کی حسین تصویر کشی کے لحاظ سے یہ چھوٹی سی کتاب اپنی نوعیت کی پہلی چیز ہے اور غالباً آخری بھی۔ کہ اب سرزمین مارواڑ کو چغتائی جیسا سپوت میسر نہیں آسکتا۔

دلی مورخہ ۱۵ نومبر ۴۱ء — شاہد احمد

زر نگار راٹھور

راٹھوڑی کھانڈے کے نام

ع

صدیوں تک جس نے گورگانی تیغہ کا ہاتھ بٹایا ہے!

بصد احترام و عقیدت

عقیدت کیش

عظیم بیگ چغتائی

"چغتائی منزل" جودھپور

۲۷ اگست ۱۹۳۵ء

سِوآنہ کی رُوحیں

سِوآنہ[1] کی پُراسرار پہاڑیوں کے خوفناک غاروں اور بلند چوٹیوں کے نشیب و فراز میں اکثر لوگوں کو سفید بلیاں دکھائی دیتی ہیں جو عموماً کسی ناخوشگوار سانحہ کا پیش خیمہ ہوتی ہیں۔ اور وہاں گھومتا ہوا کوئی اگر ان کو دیکھ لیتا ہے تو سہم کر بھاگ جاتا ہے۔ مگر اجنبی ان کی طرف غور سے دیکھتا ہے اور اُس کو معلوم بھی نہیں ہوتا کہ انکی طرف دیکھنا خطرے سے خالی نہیں ہوتا۔ وہ جانتا بھی نہیں کہ وہ ان کے پیچھے خود نہیں جاتا بلکہ جانے پر مجبور ہے۔ اتفاقاً میں نے بھی ایسی ہی ایک بلی دیکھی لیکن رع ربیاسہ بُود بلائے وے بخیر گذشت۔ سستے اور بہت سستے چھوٹے :۔

---

[1] ریاست جودھپور کا مشہور قصبہ جس کی گپھاؤں میں درگا داس راٹھور نے اورنگ زیب کے پوتہ پوتی کو چھپا دیا تھا اور چودہ برس تک وہیں پرورش کی۔

(۱)

اسی مہینے کی ۹ تاریخ کا ذکر ہے کہ میں ایک کام سے سوانہ گیا۔ کام سے فراغت حاصل کرکے سوانہ کے مشہور قلعہ کی طرف گیا۔ قلعہ کی پشت کی طرف پہاڑی کے دامن میں دور تک چلا گیا۔ سُرخ رنگ کی خاموش اور ہیبت ناک چٹانوں کا ایک عظیم الشان سلسلہ ہے جو دور تک چلا گیا ہے اور قلعہ کے ارد گرد میلوں تک زمانہ ماضی کی فوجی اور شاہی عمارتوں کے کھنڈر چلے گئے ہیں۔ یہ وہ مقام ہے جہاں علاؤالدین خلجی کی فوجیں راجپوتوں سے ٹکرائی تھیں اور یہاں قلعہ کے آس پاس نہ معلوم کس کس زمانہ میں کیسے کیسے قلعہ اور محل تھے۔

یہ پہاڑیاں بھی عجیب و غریب ہیں۔ ان کی عجیب و غریب و ہیبتناک اور تاریک سُرنگوں اور گپھاؤں کے طرح طرح کے افسانے مشہور ہیں۔ وسیع دہانہ کی ایک سُرنگ میں آپ اگر داخل ہوں تو دو تین فرلانگ تک سیدھے چلے جائیے پھر کہیں ایک عظیم الشان ہال ملے گا۔ جس کو قدرت کے ہاتھوں نے پہاڑی کے اندر ہی کاٹ کر بنایا ہے اور شاید قدیم کے رہنے والوں نے اپنے بھدے اوزاروں سے اِس ہال کو اپنی رہائش کیلئے ٹھیک کیا ہے۔ کسی نکلی ہوئی چٹان کو تراش کر تخت کا کام لیا ہے تو دیوار کے کسی گڑھے کو برابر کر کے الماری یا طاق کا کام لیا ہے۔ اب اس ہال میں دیکھئے

تو چار پانچ سرنگوں کے دہانے ہیں جو علیحدہ علیحدہ سمت میں چلے گئے ہیں۔ ان میں سے کسی میں جائیے، آگے چل کر آپ کو طرح طرح کے حال یا کمرے اسی طرح کے ملیں گے۔ ان میں سے بعض میں آپ دیکھیں گے کہ حوض بنا ہے جو پانی سے لبریز ہے۔ یہ پانی اپنے قدیمی راستے سے بارش کے زمانے میں پہاڑ کی چوٹی سے رس کر آجاتا ہے۔ پانی زیادہ ہو تو حوض بہہ نکلتا ہے۔ جب بارش ذرا کم ہو، پانی خشک ہو جاتا ہے۔ پھر اس ہال میں سے بھی اِدھر اُدھر راستے چلیں گے۔ کوئی راستہ کسی تاریک اور خوفناک کھڈ میں جا کر ختم ہو گیا اور کوئی راستہ اس قدر چھوٹا ہو گیا ہے کہ اس میں سے جانے کی ہمت نہیں پڑتی لیکن بہت سے راستے ایسے ہیں کہ ان میں گھوڑا دوڑائے چلے جائیے۔ اور بعض جگہ پہاڑی کے مشرق سے داخل ہو کر مغرب کی طرف نکل جائیے۔ یہ تمام سرنگیں قدرتی ہیں۔ صرف کہیں کہیں انسان کے کاریگر ہاتھ نے ان کو درست کر لیا تھا۔

میں ٹہلتا ٹہلتا دور تک چلا گیا۔ کوئی نصف میل بڑھا کہ مجھے عمارت کا ٹوٹا ہوا حصہ بلندی پر نظر پڑا۔ ایسا کہ میرا جی چاہا کہ دیکھوں تو کہ اس شکستہ دیوار کے اُس طرف کیا ہے۔

بڑے بڑے پتھروں اور چٹانوں میں ہوتا ہوا میں اوپر چلا گیا۔ کوئی آدھی دور گیا ہوں گا کہ ایک عجیب و غریب معاملہ پیش آیا۔ ایسا کہ میں عمر بھر

کبھی نہیں بھولوں گا۔

جاتے ہیں داہنے ہاتھ کو ایک طرف ایک ٹھوٹھ کا سخت جان درخت تھا۔ اُس کے پاس ہی ایک سفید رنگ کی بلی کھڑی تھی اور جیسے ہی میں پہونچا ہوں کہ وہ بولی۔ میں نے معاً اس کی طرف دیکھا کہ ایسی بلی بھلا یہاں کہاں سے آئی۔ میرا دیکھنا تھا کہ وہ آہستہ سے مڑ کر چلی۔ نہ معلوم کیوں میں بھی اُس طرف بڑھا۔ یہ دیکھنے کو کہ کدھر جاتی ہے۔ ایک چٹان کا ستون کھڑا تھا جس میں کوئی دو فٹ کی گگر نکلی ہوئی تھی۔ بلی اس پر گئی۔ پاس ہی تھا لہٰذا میں بھی اس گگر پر ہو کر دوسری طرف گھوم کر نکلا تو شکستہ چٹانوں کی ایک تنگ گلی سی ملی جو آگے ہی جا کر ختم ہوتی معلوم دی۔ بلی اس میں گئی تو میں بھی دس قدم بڑھا ہوں گا کہ کیا دیکھتا ہوں کہ بلی ایک چھوٹے سے غار میں گھس گئی۔ سامنے ہی غار تھا اور میں نے جو آگے بڑھ کر اُس میں جھانک کر دیکھا ہے تو۔ الامان!

تاریکی میں ایک جنبش سی نظر آئی اور ایک انتہا سے زیادہ ضعیف آواز تاریکی کے خوفناک پردوں سے لرزتی سی نکلی۔ ایسی کہ میرے بدن کے رونگٹے

کھڑے ہو گئے۔ "جے شری ماتاری"۔ راجپوتی سلام تھا۔ یہاں عادت ہے کہ راجپوتوں سے بسا اوقات یہ بھی سلام ہو جاتا ہے۔ میری زبان سے بھی جواب نکلا "جے شری ماتاری"۔ اور غور سے دیکھتا ہوں تو ایک عجیب و غریب ہستی اس مختصر غار میں دیوار سے پیٹھ لگائے بیٹھی ہے۔

گندمی رنگ کا برہنہ بدن جو سب کا سب سفید۔ رنگ کے میلے جھاڑ جھنکاڑ سے بالوں میں اُلجھا سا پڑا تھا۔ چہرہ کا پتہ لگنا مشکل۔ بالوں کی اُلجھی ہوئی لٹوں کے درمیان سے دو آنکھیں چمک رہی تھیں جن میں سے ایک کا آدھا حصہ بھنوؤں اور سر کے پریشان بالوں سے چھپا ہوا تھا۔

(۲)

میں غور سے اُس کی طرف دیکھ رہا تھا کہ اُس نے اپنا لکڑی کی طرح خشک اور سوکھا ہوا مُردہ ہاتھ اُٹھایا اور مجھے آنے کو اشارہ کیا۔ میں نے یہ سوچ کر کہ کوئی عبادت گزار سادھو ہے اور بہتر ہے اس کی قدمبوسی حاصل کی جائے۔ اور بُلاتا بھی ہے۔ لہٰذا میں جھک کر غار میں داخل ہوا۔ دونوں ہاتھ جوڑ کر جس طرح مارواڑی بزرگوں کو سلام کیا جاتا ہے۔ میں نے جھک کر سلام کیا۔ اُس نے محبت سے سر کو جنبش دی اور قریب بیٹھنے کو کہا۔ میں بیٹھ گیا۔ میں نے غور سے اس

سادھو کو دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں غضب کی چمک تھی۔ میں دراصل اس کے بالوں کو دیکھ کر حیرت میں تھا۔ ایک جنگل تھا کہ سر سے جٹاؤں کی جٹا میں لٹکی ہوئی دُور تک زمین پر پھیلی ہوئی تھیں اور اُن کو سمیٹ کر وہ اُن سے ستر پوشی کا کام بھی لے سکتا تھا۔

سادھو نے صاف ستھرا بتا رہے ہیں مارواڑی میں مجھ سے باتیں شروع کیں اور میرے لئے حیرت و تعجب کا باب کھول دیا۔ اُس نے مجھ سے کہا۔

"میں تمہارا بہت ممنون ہوں گا اگر تم ایک لاش کا کریاکرم کرنے میں ہاتھ دے سکو۔"

میں نے گھبرا کر کہا "کس کی لاش؟"

"ایک غم نصیب ہستی ہے۔"

میں نے سادھو کی طرف دیکھا۔ دراصل میں کسی طرح بھی کسی لاش سے سروکار نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ بجائے ہاں ہوں کرنے کے میں نے کہا:

"آپ یہاں اکیلے ہیں؟"

"ہاں میں اکیلا ہوں۔"

"کب سے؟"

سوکھے منہ سے بڈھے نے کہا" بہت دن ہوئے۔ اب کون سمت ہے؟
یہ سمت ۱۸۱۵ کا ذکر ہے جب میں یہاں آیا تھا۔"

"سمت ۱۸۱۵!" میں نے حواس باختہ ہو کر کہا۔ اور یہ سمجھا کہ ضرور اس کی عقل خراب ہو گئی ہے۔ "سمت ۱۸۱۵ میں آپ یہاں آئے تھے! پونے دو سو برس پہلے! اب تو سمت ۱۹۹۲ ہے۔"

سادھو نے کہا "ہاں سمت ۱۸۱۵ کی چیت بدی چھٹ کو میں نے یہاں آسن جمایا تھا۔ میرا جنم سمت ۱۷۹۱ کا ہے اور اُس وقت میں تیئیس ۲۳ برس کا ہوں گا۔"

میں بھاگنے کی تمہید اپنے دل میں اٹھا رہا تھا میں نے پھر وہی سوال کیا۔
"آپ کون ہیں؟"

"میں سادھو ہوں اب تو۔"

"اب تو........"

ہاں۔ اب تو سادھو ہوں۔ پہلے کچھ اور تھا جوانی میں۔"

"کیا تھے؟"

"سپاہی۔"

"پھر سادھو کیسے ہو گئے؟"

سادھو نے ایک ٹھنڈی سانس بھری ایسی کہ اُس کی سب کی سب پسلیاں چمکنے لگیں اور اُس نے مجھ سے کہا:۔

"کیا کرو گے پوچھ کے؟ مگر نہیں بہتر ہے کہ میں تمہیں بتا دوں بلکہ شاید ضروری ہے مگر یہ بتاؤ تمہیں تھوڑی بہت اس وقت فرصت ہے؟"

میں نے کہا "مہاراج آپ ضرور سنایئے۔ اور یہ بھی بتایئے کہ اب تک آپ زندہ کیسے ہیں؟"

سادھو نے متعجب ہو کر کہا "زندہ! زندہ ہوں میں! اوہو اب تم ذرا اطمینان سے بیٹھو اور سنو۔ سب معلوم ہو جائے گا کہ میں اب تک کیسے زندہ ہوں" سادھو نے اپنا قصہ صاف مارواڑی میٹھے لہجہ میں شروع کیا۔ جس کا مطلب یا ترجمہ حسب ذیل ہے جو پیش کرتا ہوں۔

بائی شری جاڑیچی جی

میرا نام میٹر بنیا امر سنگھ ہے۔ میرا باپ راگھوجی سوجت کے قلعدار دلیپ سنگھ جاڑیچہ کی نوکری میں تھا۔ دلیپ سنگھ کی اور میرے باپ کی پرانی دوستی تھی بلکہ بھائی چارہ تھا اور دونوں پگڑی بدل بھائی تھے۔ میرا باپ غریب تھا مگر دلیپ سنگھ جاگیردار اور قلعدار تھا۔

سوجت کے قلعہ کے پشت کی پہاڑیوں میں ایک بلند چوٹی پر دلیپ سنگھ کا محل ہے۔ دلیپ سنگھ کے بیوی بچے اسی محل میں رہتے تھے۔ یہ محل بھی ایک اچھا خاصہ قلعہ ہے۔ تم نے تو دیکھا ہوگا۔"

میں نے کہا۔ مہاراج سوجت[۲] کا عظیم الشان قلعہ گرد میں مل گیا۔ میں سوجت

---

[۱] جاڑیچہ راجپوتوں کی مشہور ذات ہے۔ ہر جاڑیچہ کی لڑکی جاڑیچی جی کہلاتی ہے۔ مشہور کرکٹ کھلاڑی رنجی ناداں نگر کے راجہ جاڑیچہ تھے۔

[۲] ریاست جودھپور کا قصبہ ہے۔ جو بی۔ بی۔ آئی ریلوے پر سوجت روڈ کا اسٹیشن ہے۔ یہ قلعہ جس کا ذکر ہے اجمیر والی سڑک کے کنارے ہی ہے۔

میں بہت رہا ہوں اور قلعہ میں کھیتی ہوتی ہے محلوں اور کھنڈروں میں گیدڑوں کا شہر آباد ہے۔ اس کی پشت پر جب مجھے تو کھنڈر ہی کھنڈر نظر آتے ہیں۔ ہاں قلعہ کے قریب شری چوانڈا جی[1] کا استھان البتہ قائم ہے۔"

سادھو نے شری چوانڈا جی کے نام پر دونوں ہاتھ جوڑ کر احترام سے اُٹھائے اور پھر مجھ سے پوچھا:۔

"تم نے اُن کے درشن کئے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "جی ہاں میں تو صبح کو دوسرے تیسرے روز جاتا تھا اُدھر تب درشن بھی کرتا تھا۔"

سادھو نے کہا۔ "افسوس۔ رہے نام مالک کا۔ ہاں اسی محل کا ذکر کر رہا ہوں جس کو تم بتلاتے ہو کہ صفحہ ہستی سے مٹ گیا۔ میں اسی محل میں بڑھا اور پلا اور جوان ہوا ہوں۔ جس کے خوفزدہ کھنڈروں کو دیکھ کر تم وحشت زدہ ہو گئے ہو۔ ذرا مجھے تفصیل کے ساتھ بتاؤ کہ اُس گہوارہ عشرت کا اب کیا حال ہے۔"

میں نے تفصیل کے ساتھ سوجت کے قلعہ اور اس کے گرد و نواح کے تمام

---

[1] راٹھوروں کی خاص خاندانی دیبی۔

کھنڈروں کا سارا حال بتایا جس کی تفصیل کی یہاں چنداں ضرورت نہیں. اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے کہ اُس نے میری آنکھوں کے سامنے محلوں کی تصویر کھینچ دی اور میں نے اس جھلکتی تصویر کو بگاڑ کر موجودہ کھنڈروں کی تصویر پیش کر دی. جہانتک عبرت کا سوال ہے، ہم دونوں نے عبرت حاصل کی۔ اُس نے کم میں نے زیادہ۔ اس کے جملۂ معترضہ کے بعد میں پھر سادھو کے قصّہ کو لیتا ہوں.

سادھو نے اپنا قصّہ پھر شروع کیا :-

"...... دلیپ سنگھ جی رات کو سوجت کے قلعہ میں رہتے تھے اور صرف دن کو اپنے محل میں تھوڑی دیر کے لئے آتے تھے.

دلیپ سنگھ کی ٹھکرانی ہاڈی[1] جی تھیں۔ میں نے سوجت ہی میں ہوش سنبھالا میرے پتا جی محل کی ڈیوڑھی کے سردار اور محل کے مختارِ کُل تھے. ٹھاکر دلیپ سنگھ کے سوائے ایک لڑکی کے کوئی اولاد نہیں ہوئی. اس لڑکی کا نام پھول کنور تھا اور محل میں سب اُس کو "سُندری بائی جی" بھی کہتے تھے۔ میں بھی چونکہ ایک نوکر کا لڑکا تھا لہٰذا میں بھی اُن کو بائی جی کہتا تھا۔

---

[1] راجپوتوں کی قوم ہاڈا۔

بائی شہری جا ریجی چھوٹی عمر سے میرے ساتھ ہی کھیلی ہوئی تھیں۔ ان کو گھوڑے کی سواری سے بہت شوق تھا اور محل میں ان کے لئے گھوڑے دوڑانے کا میدان بنوا دیا گیا۔ ابھی دس بارہ برس ہی کی عمر تھی کہ نوعمر بائی شہری جاڑیجی جی سپاہیوں کی طرح نیزہ بازی کرنے لگیں۔

بائی جی عمر میں مجھ سے چھ یا سات سال چھوٹی تھیں۔ جب وہ بارہ برس کی ہوئیں تو میں اٹھارہ برس کا ہوا اور اب میں اُن کے ساتھ نہیں کھیلا تا تھا اب خُدا کی شان کہیے یا بد قسمتی یہی وہ زمانہ تھا کہ نوعمر بائی جی میرے خیالوں میں بس کر رہ گئیں۔ بھلا غور تو کیجئے کہ کہاں ایک معزز ٹھاکر کی خوبصورت اور پڑھی لکھی لڑکی اور کہاں میں۔

بائی جی مجھ سے پردہ نہیں کرتی تھیں علاوہ اس کے یہ بھی میں جانتا تھا کہ وہ میرا خاص خیال کرتی تھیں۔ مجھے سب لوگ امرا کہتے تھے اور بائی جی کبھی پکارتیں تو امرا جی کہہ کر پکارتیں۔ میں اُن کو ہمیشہ نہایت ہی ادب سے جھک کر دونوں ہاتھوں سے تعظیم دیتا تھا اور میں دیکھتا تھا کہ وہ میرے مودبانہ دستور کو پسند کرتی تھیں۔

وقت گزرتا گیا اور بائی جی کی دلکش تصویر کا نقش میرے دل پر اور بھی

گہرا ہوتا گیا حتیٰ کہ سچ مچ وہ آنکھیں اور دل میں بس گئیں۔ مگر اُن کو مطلق علم نہ ہو سکا کہ میں اُن کے عشق میں مبتلا ہوں۔

(۲)

بائی جی کو تیرنے کا بھی بہت شوق تھا۔ چوانڈا جی کے درشن کو تو اکثر جاتی تھیں لیکن کبھی کبھی چوانڈا جی کے استھان کے نیچے جو پختہ جھیل ہے اُس میں اشنان بھی کرتی تھیں۔ چاروں طرف پہرہ لگا دیا جاتا تھا اور محل کی دو چار عورتیں اور ڈاوڑیاں (خواصیں) ساتھ ہوتی تھیں۔ اس موقع پر بائی جی اپنے تیرنے کے شوق کو پورا کرتی تھیں۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ صبح کوئی دو گھڑی دن ڈھلا ہوگا کہ سوجت کے قلعہ سے محل کی طرف روانہ ہوا۔ خیال آیا کہ لاؤ چوانڈا جی کے درشن کرتا چلوں۔ لہٰذا پہاڑی پر سے جو راستہ چوانڈا جی کو جاتا تھا اُس کی طرف چلا۔ اصل راستہ آپکو معلوم ہی ہوگا کہ جھیل کی طرف سے ہے۔ لیکن میں نے یہ سوچا کہ چکر کاٹ کر اُدھر کون جائے۔ لاؤ اسی طرف سے پہاڑی پر چڑھ جاؤں۔ چنانچہ تم نے دیکھا ہوگا راستہ نہ صرف ناہموار ہے بلکہ بعض جگہ بہت دشوار گزار ہے۔ لیکن میں جوان تھا۔ مزے میں چڑھتا چلا گیا۔ استھان پر پہونچکر میں نے چوانڈا جی کے درشن کئے اور واپس

اصلی راستے سے جانے لگا تو مجھے ایک چارن نے روکا اور کہا کہ اُدھر مت جاؤ۔ بائی جی اشنان کر رہی ہیں اور پہرہ لگا ہوا ہے۔ تم کدھر سے چڑھ آئے ہو؟ اسکے منہ سے یہ لفظ بمشکل ادا ہوئے تھے کہ جھیل کی طرف سے عورتوں کے چیخنے چلّانے کا شور برپا ہوا۔ بائی مہری جا "بچی جی ڈوب رہی تھیں" اور تمام عورتیں چیخ رہی تھیں: "بائی جی ڈوب رہی ہے۔ بائی جی ڈوب رہی ہے!" کسی کے ڈوبنے کی خبر سن کر ویسے ہی ہوش خطا ہو جاتے ہیں اور بالخصوص میرے لئے یہ خبر پیغام موت سے بدتر تھی۔ لہٰذا بدحواس ہو کر میں راستے کی طرف دوڑا مگر تھوڑی ہی دور جانے پایا تھا کہ مجھے پہرے کے سپاہی نے روک دیا اور باوجود میری کوشش کے اُس نے جانے نہ دیا۔ مجبوراً میں پھر پلٹا اور اوپر آ کر استھان کی دیوار پر چڑھ گیا اور دیوار سے کود پڑا۔ دیوار چار پانچ گز اونچی تھی۔ اور یہاں سے بالکل ناہموار ڈھال پر سے پتھروں میں سے ہوتا ہوا سامنے چٹان پر پہونچا اور یہاں سے جو نظارہ میں نے دیکھا اُس نے مجھے پاگل کر دیا۔ بائی جی واقعی ڈوب رہی تھی اور کنارے کی عورتوں کی رسائی سے بہت دور تھی میں دیوانہ وار اس چٹان سے آگے بڑھ کر نیچے والی چٹان پر پہونچا۔ یہاں تم نے دیکھا ہوگا دور تک کھلا ہوا راستہ چلا گیا ہے۔ پہاڑی کے سہارے اس راستے پر میں دوڑا

چلا گیا اور تیزی سے میں اُس جگہ پر پہونچ گیا جو ایسی تھی کہ جس پر سے کود کر میں جھیل میں گر سکتا تھا۔ چنانچہ عورتوں کے بے ہنگام شور وغل میں ہمت کر کے میں نے ایک جست لگائی اور کوئی پچیس گز کی بلندی پر سے سیدھا جھیل میں کود پڑا۔ گرنے کے زور میں نیچے تک ڈوبتا چلا گیا لیکن پھر مجھے پانی نے اوپر پھینکا تو میں نے دیکھا کہ فاصلہ پر بائی جی پانی سے آخری زور آزمائی کر رہی ہیں اور امداد کے لئے چیخ رہی ہیں۔ میرے جھیل میں گرنے سے عورتوں کا شور وغل ایکدم سے بند ہو گیا تھا اور میں نے وہیں سے آواز دی۔ "بائی جی گھبرا نا مت میں آتا ہوں"۔ اور یہ کہتے ہوئے جس قدر بھی مجھ سے تیزی سے ہو سکا پانی کو چیرتا ہوا بائی جی کے پاس پہونچا۔ بائی جی کا بُرا حال تھا اور اُن پر سخت وحشت طاری تھی۔ میرے پہونچتے ہی وہ مجھ سے بُری طرح چمٹ گئیں۔ ایسی کہ مجھے بڑا لحاظ معلوم دیا کیونکہ اُن کا لباس ضرورت سے زیادہ غیر ساتر تھا۔ میں نے بائی جی کو بائیں ہاتھ سے اپنی گود میں سنبھالا اور اُنہوں نے میری گردن میں چمٹ کر اپنا ہاتھ حائل کر دیا۔ اور ایک ہاتھ اور پاؤں سے میں پانی کاٹ کر کنارے پر پہونچا اور بائی جی کو اُنکی داؤڈھیوں کے سپرد کر کے جھیل میں پانی آنے کی پختہ موریوں میں سے گھس گیا اور جا کر قلعہ کی موریوں کے پاس نکلا۔ یہاں پہونچکر میں نے اپنے کپڑے نچوڑے

اور محل میں چلا آیا۔ بائی جی کو جس وقت میں پانی میں سے چیرتا ہوا لا رہا تھا اُس وقت میں نے اُن کے ساتھ ایک گستاخی بھی کی تھی یعنی اُن کے رُخسار کو چوم لیا تھا۔ یہ خطا مجھ سے ایک بے بسی کے عالم میں سرزد ہو گئی تھی۔ لیکن بائی جی نے مجھ سے کچھ بھی نہ کہا۔ بُرا بھی نہ مانیں بلکہ شرما کر اپنا رُخسار میری گردن میں چھپا لیا۔ لیکن دفعتاً مجھے احساس ہوا تو میں نے لجاجت کے ساتھ ـــــ اُن سے معافی مانگی اور کہا۔ "اگر آپ کو بُرا معلوم ہوا ہو اور آپ اس گستاخی کو معاف نہ کر سکتی ہوں تو میں یہ بہتر سمجھوں گا کہ آپ کو کنارے پر پہونچا کر بطور سزا اسی پانی میں ڈوب مروں۔" بائی جی نے منہ سے تو اس کا جواب کچھ نہ دیا لیکن میں سچ کہتا ہوں کہ اُنکی آنکھوں نے نہ صرف مجھ سے یہ کہہ دیا کہ ایک سرے سے اوّل تو یہ کوئی خطا ہی نہ تھی اور تھی بھی تو میری نہ کہ تیری! اور جب میں نے اونہیں کنارے پر پہونچایا ہے تو پھر اُن کی آنکھوں نے اسی بات کی دوبارہ تصدیق کی اور وہ بھی اس پیرائے میں کہ مجھے معلوم ہوا کہ خطا کا سوال ہی نہ تھا۔

(۱۳)

قصہ کو اس طرح مختصر کرتا ہوں کہ کسی دوسرے کو کانوں کان خبر نہ ہوئی اور طرفین یعنی میں اور بائی جی ایک دوسرے کے ہو کر رہ گئے۔

میں چونکہ محل ہی میں رہتا تھا اور رجھ سے پردہ بھی نہ تھا لہٰذا عشق کی کہانیاں اور بھی جلد مرتب ہونے لگیں۔ نتیجہ یہ کہ بائی جی خود میری محبت میں چور ہو کر رہ گئیں۔ عورت کی محبت نہ صرف ایک دولت ہے بلکہ ایک ایسی نعمت ہے اور ایک ایسی پرفسوں چیز ہے جس کی نہ صرف رنگینی بلکہ زبردست قوت کا احساس آدمی کو کچھ سے کچھ بنا دیتا ہے۔ مگر یہاں یہ حال تھا کہ میں ایک ادنیٰ چاکر اور وہ ایک زبردست قلعہ دار اور جاگیردار کی بہیتی بیٹی۔ چنانچہ ان امور کو مد نظر رکھتے ہوئے مجھے اندیشہ تھا کہ ضرور کسی نہ کسی دن یہ رنگین محبت برے دن دکھائیگی۔

جالور[1] کے قلعدار کا ایک نوجوان لڑکا تھا۔ اس کا نام دلاور سنگھ تھا۔ یہ ایک بڑا منچلا اور شیر دل جوان تھا۔ عموماً لوگ اس کو "دل جی کو بناوت[2]" کے نام سے پکارتے تھے۔ جب شیر بائی جی کی عمر چودہ پندرہ برس کی ہوئی۔ اور یہ وہ وقت تھا کہ میں ان کی اور وہ میری محبت میں فنا ہو رہے تھے کہ بائی جی کے والد بیمار پڑ گئے۔ بچنے کی جب کوئی آس نہ رہی تو انھوں نے یہ وصیت کی کہ میرا

---

[1] جودھپور کا قلعہ اور قصبہ ہے قلعہ نہایت مستحکم ہے یہاں علاؤالدین خلجی نے زور آزمائی کی تھی۔
[2] راٹھور بنس جو کہ نباجی کی اولاد میں ہیں گو نباجی جودھاجی کے بھائی تھے جنھوں نے جودھپور بسایا۔

قلعہ یعنی محل مع آس پاس کی زمین کے دلجی کو نباونت کو دیا جائے اور میری لڑکی بھی اسی کو بیاہ دی جائے۔ چنانچہ اس بارے میں انہوں نے دلجی کے باپ کو ایک خط بھی لکھ دیا جو ان کا بڑا دوست تھا۔ بائی جی کے والد کا وصیت کے پندرہ دن کے اندر ہی اندر انتقال ہوگیا۔ ان کے صرف ایک ہی ٹھکرانی ہاڈی جی تھیں جو ان کی چتا میں بیٹھ کر ستی ہو گئیں۔ اب صرف بائی جی رہ گئیں اور جالوروالوں نے آن کر قلعہ کی کنجیاں اپنی تحویل میں لے لیں اور سوگ ختم ہونے کے جالوروالوں نے شری بائی جی سے شادی کی تہیہ اٹھائی۔

میرے لئے یہ وقت انتہا سے زیادہ سخت تھا۔ ایک دن کا ذکر ہے کہ میں چپکے سے رات کے وقت ایک ایسی جگہ جا پہونچا جہاں بائی جی مجھے اکیلی مل گئیں۔ اور میں نے حال دل سنا کر فریاد کی تو انہوں نے کہا کہ "میں عورت ہوں تم مرد ہو یہ قسمت تمہارے ہیں زیادہ مجبور ہوں" میں یہ سن کر اور ان کو اپنی محبت میں متزلزل سمجھ کر واپس چلا آیا۔ لیکن نہیں میرا خیال غلط تھا دوسرے ہی دن محل میں ایک تہلکہ سا مچ گیا۔ یہ واقعہ تھا کہ بائی جی نے کو نباونت سے شادی کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس قصے نے ایسا طول کھینچا کہ سارا محل زیر و زبر ہوگیا۔ بائی جی کا کہنا تھا کہ "میں کسی سے بھی شادی نہیں کروں گی۔ میں تو پشکر کے تال پہ جا کر فقیری

لے لوں گی۔" لاکھ عورتوں نے سمجھایا بجھایا مگر وہ نہ مانی اور اس دوران میں کہ بناوتوں نے جو یہ خبر سنی تو جانور سے ایک دستہ لیکر سیدھے محل کی طرف دوڑ پڑے اور قلعہ کے ہر شعبہ اور محکمہ پر قبضہ کر کے بائی جی کے رنگ محل کے ارد گرد گھیرا ڈال دیا مطلب یہ کہ یوں راضی خوشی نہیں تو زبردستی شادی کر لیں گے۔ چنانچہ خود نوجوان کو بناوت بھی آ گیا۔ اور باہر اس نے ڈیرے ڈال دیئے اور اس کے بعد کو بناوتوں نے محل کی تمام بارسوخ عورتوں کو اپنی طرف ملا کر بائی جی پر جائز و ناجائز دباؤ ڈال کر ان کو اپنے باپ کی وصیت پر عمل کی ترغیب دلانی شروع کی۔ مجھے کو بناوتوں سے نفرت ہو گئی۔ کیونکہ علاوہ رقیب ہونے کے کو بناوت نے سب سے پہلے میرے باپ ہی کو نکالا تھا چنانچہ میرے والد تو گاؤں چلے گئے لیکن میں نہ گیا اور جا بھی کیسے سکتا تھا۔ بڑی سخت کشمکش اور رد و قدح کے بعد بائی جی کو چھ ماہ کی مہلت ملی تھی کہ اس دوران میں جو کچھ بھی سوچ بچار کرنا ہے سوچ سمجھ لیں۔ اور اس مہلت ملنے کے بعد ہی سو جت چھوڑ کر میں اپنے گاؤں آیا تھا اور اس فکر میں تھا کہ یار دوستوں کو جمع کر کے کسی طرح سوجت لے چلوں اور جس طرح بن پڑے بائی جی کو نکال لاؤں۔ لیکن مجھے گھر آئے ہوئے کوئی بیس پچیس دن ہوئے ہوں گے کہ میں نے ایک عجیب و غریب خواب دیکھا۔

"کیا دیکھتا ہوں کہ بائی شری جاڑیچہ جی سولہ سنگار کئے بال بال موتی پروئے حسن وعشق کی مجسم تصویر رنگ محل کی مہر جھیون پر کھڑی ہیں۔ اور داہنا ہاتھ ان کا ان کے سامنے۔ اُنگلی اٹھی ہوئی مشعل کی طرح جل رہی ہے جس کی تیز روشنی کا نور اُن کے سُرخ وسفید چہرے پر ایک عجیب انداز سے پرتو فگن ہے۔ ایسا کہ میں اُن کے حسن لاثانی کو دیکھتا کا دیکھتا رہ جاتا ہوں مگر فوراً ہی جھک کر سلام کرتا ہوں اور دونوں ہاتھ جوڑ کر پوچھتا ہوں کہ 'بائی جی یہ مشعل ....!"

ایکدم سے اُن کے حسین وجمیل چہرے پر دلفریب لرزش سی ہوتی ہے اور مسکرا کر کہتی ہیں۔ "امراجی یہ تمہاری محبت کی آگ ہے"۔

میرے منہ سے ایکدم سے ایک لاوینہ چیخ نکلی اور میں سوتے سے جاگ پڑا، ایسا گھبرایا کہ اُسی دن سوجت کی راہ لی۔ بائی جی نے سچ مچ مجھے بیتاب کر دیا۔

جب میں سوجت پہونچا تو معلوم ہوا کہ کونباوتوں نے قلعہ میں اپنی فوج رکھ دی ہے اور محل کے چپہ چپہ پر پورا قبضہ ہے چنانچہ جب میں وہاں گیا تو مجھے محل میں کسی نے گھسنے بھی نہ دیا۔ مجبوراً میں نے سوجت میں قیام کیا۔

محل کے خاص خاص لوگوں اور زنانہ درگاہوں سے ملا تو معلوم ہوا کہ کونباوتوں اور بائی جی کے درمیان بائی جی کی ایک رشتہ کی دادی پڑی ہیں اور اُنہوں نے

بائی جی کو راضی کر لیا ہو۔ چنانچہ بہت جلد کونبآوت کی شادی بائی جی سے ہو جائیگی۔ میرے لئے یہ خبر ناقابل برداشت تھی اور اب میں نے یہ سوچا کہ جان پر کھیل جاؤں۔ میں نے خود کونباوت سے ملنے کا ارادہ کیا مگر میں چاہتا تھا کہ کسی ایسی جگہ ملوں جو یہاں کے تاثرات سے ملوّث نہ ہو۔ چنانچہ ایسا موقع بہت دن کے اندر ہی اندر مل گیا۔ کونباوت کو کسی ضرورت سے جالور جانا پڑا اور جالور میں مجھے موقع ملا کہ کونباوت سے تنہائی میں بات چیت کر سکوں۔

ایک درخت کے نیچے ہم دونوں کھڑے تھے۔ کونبآوت اپنے گھوڑے کی باگ ڈور پکڑے کھڑا تھا اور ہم دونوں میں باتیں ہو رہی تھیں۔ میرا خیال تھا کونباوت کو میرے اور بائی جی کے عشق و محبت کا علم نہ ہوگا۔ لیکن یہ خیال غلط تھا کیوں کہ ملاقات ہوتے ہی پہلی بات جو کونباوت نے مجھ سے کہی وہ یہ تھی :۔

"تم ہاتھی سے گنا لینا چاہتے ہو؟ نتیجہ معلوم ہے؟"

میں نے کہا۔ "آپ بڑے جاگیردار کے کنور ہیں۔ آپ کو قلعہ چاہئے ہو محل چاہئے ہو، لیکن یہ واقعہ ہے کہ آپ کو جاڑیچی نہیں چاہئے۔ آپ تو قلعہ کی لالچ میں بائی جی کو چاہتے ہیں۔ میں چھوٹا آدمی ہوں اور بہتر ہے کہ آپ کوئی اونچا گھر دیکھیں۔ کیا آپ کے سے بانکے کونباوت کے لئے یہ امر باعث ذلت نہیں کہ آپ اپنے لڑ بڑے

پیسے کے زور سے اور جاہیتوں کی تعداد کے زور سے جاڑیجی کو جیتنا چاہتے ہیں۔"

کونہا وت کا نوجوان چہرہ غصہ سے تمتما اٹھا اور اس نے حقارت آمیز لہجہ میں مجھے جھڑک کر کہا۔" بالکل غلط ہے۔"

میں نے کہا۔" پھر آؤ ہم تم تلوار سے فیصلہ کر لیں۔"

کونہاوت نے جواب دیا۔" مجھے کوئی ضرورت نہیں کہ تمہارے ایسے سپاہیوں سے لڑتا پھروں۔"

میں نے جل کر کہا۔" کنور صاحب اچھی طرح سمجھ لیجئے اگر آپ چاہتے ہیں کہ جاڑیجی آپ کی ہو جائے تو مجھ سے جیتنا پڑے گی۔ اگر مجھ سے مقابلہ کی ہمت نہ ہو تو بہتر ہے کہ اس کا خیال دل سے نکال دیجئے۔"

کونہاوت بولا میری تلوار غالباً تم حبشیوں سے بہتر لوگوں کے خون پینے کے لئے بنی ہے۔ لہذا بہتر ہے کہ تم یہاں سے دور رہو میں فضول گوئی نہیں چاہتا۔ اور یاد رکھو اگر کہیں میں نے تمہیں وہاں آس پاس دیکھ لیا تو تمہارا سر تن سے جدا نظر آئے گا۔"

آخری لفظ کونہاوت کے منہ سے ادا ہوئے ہی تھے کہ اس نے اپنے سامنے میری پشت کی طرف اس طرح دیکھا کہ مجھے شبہ ہوا کہ میرے پیچھے سے کوئی آرہا ہے جسے اس

نے دیکھا ہے۔ سامنے کچھ فاصلہ پر کونباوت کے دو آدمی کھڑے تھے! دھر نظر ڈالی تو وہ غائب۔ لہذا کونباوت کی نظر میری پشت پہ گئی ہو کہ میں نے بھی مڑ کر دیکھا میرا دیکھنا تھا کہ ایکدم سے کونباوت کے وہی دونوں آدمی میرے اوپر ننگی تلواریں لیکر جھپٹ پڑے اور کونباوت نے کہا "لینا" مگر قبل اس کے کہ میرے اوپر حملہ ہو میں اُچھل چکا تھا اور میری ڈھال میرے بائیں ہاتھ میں تھی اور میرے دائیں ہاتھ میں۔ دونوں نے ایک جھپٹ کے ساتھ میرے اوپر وار کئے۔ ایک کے وار کو میں نے ڈھال پر لیا اور دوسرے کے وار کو مجھے مجبوراً اپنی تلوار پر روکنا پڑا۔ یہ دونوں آدمی نہ معلوم کون ذات تھے مگر راجپوت نہیں تھے قتل کرنا چاہتے ہوں گے مگر لڑنا نہیں جانتے تھے چنانچہ میں نے چشم زدن میں ایک کا پیر کاٹ دیا اور دوسرا از خود بھاگ نکلا۔ اب میں کونباوت کی طرف لپکا لیکن کونباوت گھوڑے پر سوار ہو چکا تھا! وراس کے ہاتھ میں برچھا تھا ایکدم سے اُس نے میرے اُوپر گھوڑا ریل دیا۔ میں نے بمشکل اپنے کو بچایا ورنہ اُس نے نیزے میں پرو لیا ہوتا میں نے مروہی کا ہاتھ ترچھا لگا کر نیزہ روکا۔ کونباوت قہقہہ لگاتا نکل چلا گیا۔ غالباً وہ جانتا تھا کہ مجھ سے مقابلہ آسان نہیں ہے اُس کا ساتھی دور تک میرے پیچھے پیچھے آیا مگر قریب نہ آیا جس تارجلا مجھ سے ہو سکا میں جالوری بھاگ کر سوجت آیا اور یہاں

مجھے معلوم ہوا کہ بائی جی اب شادی کے لیے ہر چہار طرف سے دباؤ ڈال کر راضی کر لی گئی ہیں اور شادی کی تاریخ مقرر ہونا باقی ہے۔

۳

میری ہر کوشش بائی جی کو خط پہونچانے یا اُن کا صحیح حال معلوم کرنے کے لیے بیکار ثابت ہوئی۔ آخر ش وہ دن آیا کہ محل توپوں کی گرج سے گونجنے لگا۔ کوہناوت کی شادی بائی جی سے ہو گئی۔ میں تڑپتا رہ گیا۔ اور اُس نے جارینجی کو بغیر لڑے بھڑے فتح کر لیا مگر نہیں۔ یہ کیونکر ممکن تھا۔ میں تو ابھی زندہ تھا۔

صبح تین بجے شادی ہوئی تھی جس کا توپوں نے اعلان کیا تھا۔ میں نے پانچ منٹ سے زیادہ انتظار نہیں کیا۔ رات ہی کو چل کھڑا ہوا۔ محل کیا تھا ایک سنگین قلعہ تھا۔ اب مجھے یہ قلعہ فتح کرنا تھا۔

میں قلعہ کی پشت پر پہونچا۔ چٹان چھیل کر دیوار کی طرح کر دی گئی تھی اور مجھے اس پر چڑھنا تھا۔ لوہے کی کیلیں گاڑ گاڑ کر بڑی محنت سے میں چٹان کا بلند ترین حصہ فرسے میں چڑھ گیا۔ اس کے بعد پھر دشوار گذار اور خطرناک راستہ تھا۔ تمام چٹانوں کی چوڑی کگریں چھیل دی گئی تھیں اور تین مقامات مجھے ایسے

طے کرنا پڑے۔ جہاں میں دیوار سے چمٹ کر گلہری کی طرح گذرا۔ صبح ہوئی اور سورج نکل رہا تھا اور میں نے شایا۔ ایک چوتھائی حصہ مسافت بھی طے نہ کیا تھا۔ دو گنبد کی بلندی پر پہونچنے میں مجھے پورے تین گھنٹے لگ گئے تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ گھنٹہ بھر بعد ہی سامنے کھیتوں میں آدمی آجائیں گے۔ لہذا جلد سے جلد مجھے ایک منزل اور چڑھ جانا چاہیے۔ جہاں میں پوشیدہ رہ سکتا تھا۔ چنانچہ گھنٹہ بھر کی سخت مشقت اور محنت کے بعد میں اس قلعہ کی پشت کی چٹان کی ایک منزل اور طے کر چکا تھا یہاں سے میں بڑی تیزی کے ساتھ دیوار سے لگا لگا دور تک چلا گیا اور ایسی جگہ پہونچ گیا جہاں سے قلعہ کی تعمیرشدہ دیوار شروع ہوتی تھی اس جگہ تھوڑا اور دوسرے بیجیا درختوں کی دو چار جھاڑیاں تھیں اور شام تک میں آرام سے اس جگہ سو گیا۔ میں اپنے ساتھ تھوڑا سا پانی لایا تھا اور تھوڑا سا کھانا۔ جب رات ایک گھڑی آئی تو میں نے کمر سے کمند کا لچھا نکال کر فصیل پر مارا۔ دوسری کوشش میں کامیابی ہوئی اور چشم زدن میں دیوار پر پہونچا اور کمند ہی کے ذریعہ آہستہ سے لٹک کر اندر پہونچ گیا۔ میں جس جگہ پہونچا ہوں یہ محل کے باغ کا سب سے اجاڑ حصہ تھا اور جہاں میں کھڑا تھا اس جگہ سے سامنے بلندی پر رنگ محل چمک رہا تھا۔ راستے میں پتھر اور مٹی کے عظیم الشان ٹیلے تھے جو محل کی کرسی تک بلند ہوتے چلے گئے تھے۔

میں تھوڑا ہی آگے گیا تھا کہ مجھے معلوم ہوا کہ رنگ محل کے ارد گرد کو بناوت کا سخت پہرہ ہے کوئی آدھ گھنٹہ تک ادھر اُدھر پھرتا رہا مگر کسی طرف سے مجھے راہ نہ ملی اور میں مجبور ہو گیا ہو کر رنگ محل کی پشت کی طرف جا کر بیٹھ گیا اور وہاں سے میں نے نظر رنگ محل کے پھاٹک پر جمادی تا کہ جس وقت کو بناوت اندر داخل ہو تو محل میں گھس جاؤں۔

آدھی رات کے قریب محل کے صدر دروازے پر سینکڑوں مشعلوں کی روشنی نظر پڑی میں جانتا تھا کہ سب پہرہ دار جس وقت اس تیز روشنی کو دیکھتے ہوں گے وہی موقعہ نکلنے کا ہے اور مجھے امید تھی کہ اندھیرے میں میرے چلنے کی اگر آہٹ بھی کسی نے سن لی اور روشنی کی طرف سے نظر ہٹا کر اندھیرے میں اگر مجھے دیکھنا چاہے گا تو مارے چکا چوند کے خاک بھی نہ دیکھ سکے گا۔

مشعلچیوں کے جلوس کے ساتھ کو بناوت پوری راٹھوری شان سے مع اپنے مسلح سپاہیوں کے داخل ہوا ہر پہرے دار قاعدہ تماشا دیکھنے کو نہ صرف اپنی جگہ چھوڑ ذرا آگے بڑھ گیا بلکہ اپنے قریب والے کے پاس پہونچ گیا تا کہ اپنے سردار پر اچھی طرح رائے زنی کر سکے۔ اس زریں موقع سے میں نے فائدہ اٹھایا اور بڑی صفائی سے محل میں داخل ہو گیا۔ سب راستے میرے دیکھے ہوئے تھے۔ اس طرف

اول تو ویسے بھی روشنی کم تھی اور جو دو چار شمعیں تھیں اُن کو میں بجھاتا ہوا پشت کے زینے سے محل کی پہلی منزل پر پہونچا۔ اور وہاں سے ایک کھڑکی میں سے نکل کر چھجے پر پہونچا۔ آگے راستہ صاف تھا۔ جالیوں میں پیر رکھتا ہوا اوپر چھجے کو پکڑتا ہوا محل کے بلند ترین حصے یعنی تیسری منزل کی دُھر چھت پر جا پہونچا۔ اس چھت کے بیچوں بیچ میں ایک بڑا سا روشندان تھا جس کے اوپر ایک چھتری سی بنی ہوئی تھی۔ میں اس چھتری میں گھُس گیا اور نہایت ہی خاموشی کے ساتھ میں نے اندر جھانک کے دیکھا۔

شروع جاڑوں کا موسم تھا۔ کمرہ دُلہن کی طرح سجا ہوا تھا اور جس وقت میں نے جھانک کے دیکھا ہے تمام داڑھیاں اور خدمتگارنیاں آپس میں ہنستی اور چہل کرتی کمرہ چھوڑ کر جا رہی تھیں کیونکہ کوبناوت آ رہا تھا چشم زدن میں کمرہ بالکل خالی ہو گیا۔ بلکہ چاروں طرف سامنے چھت پر سے بھی عورتیں نیچے چلی گئیں اور سناٹا چھا گیا۔ کافی دیر ہو گئی اور سناٹا بدستور رہا کہ اتنے میں ایک سرسراہٹ کے ساتھ جاریچہ جی مجھے نظر آئی۔ سارا کمرہ جھاڑوں اور کنول کی روشنی سے جگمگا رہا تھا۔ عود، اگر اور لوبان کی خوشبوؤں سے سارا کمرہ مہک رہا تھا اور جاریچہ جی حُسن مجسم، سولہ سنگھار کے آراستہ و پیراستہ، بال بال موتی پروئے کوبناوت

کا انتظار کر رہی تھی۔ میں نے اُس کے حسین اور خوبصورت چہرہ کو غور سے جھاڑوں اور فانوسوں کی روشنی میں دیکھا۔ حُسن و خوبصورتی کے نور سے سارا چہرہ بھڑک رہا تھا۔ اور ایک دلربا سنجیدگی اُس کے چہرے پر اِس طرح مسلّط تھی کہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ اُس کے اندرونی جذبات گویا کچل کے رہ گئے تھے۔ طبیعت کی گرانباری کا اثر باوجود حُسن و سنگھار کے چہرے پر تھا۔ آنکھیں جلدی جلدی جھپک کر طبیعت کے اندرونی انتشار کو ہویدا کر رہی تھیں کہ اتنے میں کھٹکا ہوا۔ جاڑیچی جی کے چہرے پر ایک بجلی سی چمک گئی۔ کونباوت آ گیا، دروازے میں داخل ہوا۔ بڑی آن بان سے شاہانہ لباس پہنے ہیرے کی کلغی لگائے نہایت شان سے دولھا بنا داخل ہوا۔ جاڑیچی جی نے شرم سے سر جھکا لیا اور تھوڑا سا مُڑ گئی۔ کونباوت آہستہ سے اور گونہ احترام کے ساتھ جاڑیچی جی کی طرف بڑھا۔ اور جاڑیچی جی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر سر جھکایا ہی تھا کہ بیچوں بیچ کمرے میں نرم نرم غالیچوں پر میں ایک دم سے کود پڑا۔ اور اُٹھتے اُٹھتے میں نے کہا "خبردار"

ایک بجلی تھی جو دفعتاً جاڑیچی اور کونباوت پر گری۔ مُنہ سے ایک دبی ہوئی چیخ نکلی اور کونباوت بھوچکا سا رہ گیا۔ میں نے آگے بڑھ کر پُر زور مگر خاموش لہجے میں کونباوت سے کہا "خبردار! ابھی میں زندہ ہوں میں ہوتا تیرے سامنے کھڑا

پہلے میرے خون سے ہاتھ رنگ لے۔" اور جاڑیچی جی سے میں نے کہا۔" دیکھو یہ تمہارے سامنے کھڑا ہے، جس نے مجھ سے مقابلہ کرنے سے انکار کیا۔ یہ بزدل ہے، جس نے اپنے نوکروں سے میرے اوپر پیچھے سے حملہ کرایا اور پھر میرے سامنے سے بھاگ گیا۔" پھر کو بناوت کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔" کنور صاحب! میں سوئمبر میں نہتا کھڑا ہوں جو کچھ کرنا ہے کر لیجیے۔" اور میں آپ کے منہ پر کہتا ہوں کہ ان کو تم نے اپنے پیسے اور آدمیوں کے زور سے لینا چاہا ہی مگر تم نے دیکھ لیا کہ میں موجود ہوں۔"

جاڑیچی جی نے کو بناوت کی طرف دیکھا۔ چونکہ میں نے سچ کہا تھا اور وہ لبار میرے کہنے کی تکذیب کی متوقع تھی لہٰذا میں نے موقع کو دیکھتے ہوئے کو بناوت سے کہا۔" کو بناوت تم راجپوت ہو جھوٹ نہیں بولو گے۔ لیکن اگر جھوٹ بول کر اپنی بات اونچی کرنی چاہتے ہو تو تمہیں اختیار ہے جو میں نے الزام دیئے ہیں ان سے یا انکار کرو یا اقرار۔ اگر انکار کرو تو میں ابھی چلا جاؤنگا۔ دوسری بات یہ ہے کہ میں اب پھر تم کو ابھی مقابلہ کی دعوت دیتا ہوں۔ تم مجھ سے مقابلہ کرتے ہوئے ڈرتے ہو۔ لہٰذا یا تو مجھ سے مقابلہ کرو ورنہ کہہ دو کہ مجھ سے مقابلہ نہیں کر سکتے اور میں چپ چاپ یہاں سے چلا جاؤں گا۔ تیسری صورت یہ ہے کہ تلوار نکال کر ابھی

میرا خاتمہ کر دو۔ یا ذلیل نوکروں کے ہاتھوں مجھے قتل کرا دو۔ تم جانتے ہو کہ ان تین باتوں میں سے راجپوت کس کو پسند کرتا ہے، مجھے جلدی جواب دو تاکہ قصّہ ختم ہو۔"

کونباوت بھی آخر راجپوت تھا۔ اُس کی ذلت اُس کی بیوی کے سامنے ہوئی تھی۔ طیش میں آکر اُس نے اپنی سروہی اور تلوار نکال کر فرش پر پھینکدی اور مجھ سے کہا۔ "ان دونوں میں سے چاہے سروہی لیلے چاہے تلوار اور آجا میرے سامنے۔"

میں نے سروہی اُٹھالی اور اُس نے تلوار۔ ڈھال دونوں میں سے کسی کے پاس نہیں تھی۔ میں نے تجویز کی کہ مسہری کے گول تکیے بجائے ڈھال کے مناسب ہوں گے۔ چنانچہ ایک تکیہ میں نے لے لیا اور ایک اُس نے ہم دونوں آمنے سامنے آئے اور اس وقت میری نظر جاڑیچی جی کی نظروں سے چار ہوئیں میرے دل میں ایک برچھی سی لگی کیونکہ میں نے محسوس کیا کہ گویا وہ میرے طرز عمل کی دل میں شاکی ہے کہ میں نے اس کے حجلۂ عروسی کو میدان قتال بنا دیا۔ ایکدم سے میرا دل ڈوب گیا اور میں نے سروہی اور تکیہ پھینک دیا۔ اور جاڑیچی جی سے نرمی سے کہا۔ "جاڑیچی جی مجھے معاف کرنا۔ میں نے خود غرضی کی۔ اگر کونباوت میرا مقابلہ نہیں کر سکتا اور مجھ سے ڈرتا ہے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ میں تمہاری زندگی تاراج

کرنے کے لئے اس طرح اُٹھوں، کہا "میں جاتا ہوں" اور یہ کہہ کر میں پلٹا کہ ایکا ایکی میں سے لپک کر کونباوت نے میرا ہاتھ پکڑا اور کہا "او بیٹر تیا! جاتا کہاں ہے؟ تو یہ چاہتا ہے کہ میرے منہ پر کالک لگا کر رفوچکر ہو جائے؟ اُٹھا سروہی[1]" یہ کہہ کر مجھے آگے کو کھینچ لیا۔ میں نے پھر انکار کیا اور چپ کھڑا جاڑیچی کی طرف دیکھنے لگا۔ کونباوت نے مجھے خاموش دیکھ کر پھر مجھے جھڑکی دی اور سروہی اُٹھا کر میرے ہاتھ میں دی۔ تکیہ میں نے خود جھک کر اُٹھا لیا اور ہم دونوں اپنی اپنی تلوار کا قبضہ چوم کر اور جوش جوانی میں جھوم جھوم آگے بڑھے۔ "اور جے شری جاڑیچی جی" میرے منہ سے نکلا اور چشم زدن میں تلواریں چمکنے لگیں۔ جاڑیچی جی کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ اور وہ پریشان ہو کر مسہری پر بیٹھ گئی اور ہماری جنگ کو دیکھنے لگی۔

کونباوت بزدل نہ تھا، امیر تھا تلوار کا بھی دھنی تھا زیادہ تر ہم دونوں کے وار خالی جا رہے تھے کیونکہ ڈھال نہ ہونے سبب ہم دونوں ایک دوسرے سے فاصلے پر رہنے پر مجبور تھے۔ لیکن تھوڑی ہی دیر میں ہم دونوں نے ایک دوسرے کو

[1] سروہی بہ نسبت تلوار کے زیادہ خمدار اور ہلکی ہوتی ہے۔ راجپوت عموماً تلوار کی بجائے سروہی اور کھانڈا زیادہ پسند کرتے ہیں۔

ہلکے ہلکے زخم پہونچائے میرے سینہ پر تلوار کی نوک اچٹتی ہوئی لگی اور کونباونت کے
کندھے پر لگی کبھی میں پیچھے ہٹتا چلا جاتا تھا اور کبھی وہ ہٹتا چلا جاتا تھا۔ ایک
دفعہ وہ پیچھے ہٹتا چلا گیا۔ اور ایکدم سے اُچھل کر میرے سر پر ایک سخت ضرب لگائی۔
میں نے تلوار والے ہاتھ اور تکیے والے ہاتھ دونوں ملا کر تکیہ سے وار کو روکا۔ مگر
تکیہ والے ہاتھ کی میری چھنگلی اُڑ گئی اور ہتھیلی کٹ گئی۔ مجھے داہنی طرف اُچھل کے
آنا پڑا۔ کونباونت نے بھی پینترا بدلا اور اب ہم دونوں اس طرح آمنے سامنے
تھے کہ جاڑیچی جی کی مسہری کونباونت کی پشت کی طرف تھی اور میرے مقابل میں
تھی لیکن اس پینترے پر بھی آتے ہی کونباونت نے پھر ایک بھرپور ہاتھ مارا۔ میں نے
یہ ہاتھ تلوار سے روکا اور روکتے ہی میں نے چھوٹ کے ہاتھ شروع کر دیے اپنے
کہ تین قدم کونباونت کو پیچھے ہٹنا پڑا۔ اور سر تا کر جو میں نے کونباونت کے سینے میں
سروہی کا ہولا دیا ہے تو اُس نے تکیہ سے روکا۔ سروہی تکیہ کو چھپا کر سینے کو توڑتی
ہوئی پار نکل گئی اور کونباونت میرے ہولے کے زور سے جاڑیچی جی کے پاس ہی
مسہری پر گرا۔ جاڑیچی کے مُنہ سے ایک چیخ نکلی۔ میں نے سروہی ہاتھ سے چھوڑ دی
تھی جو کونباونت کے دل میں پھنسی کی پھنسی رہ گئی تھی۔ کونباونت نے تمکل دو تین ہچکیاں
لیں اور ختم ہو گیا۔ حُجلۂ عروسی میں خون ہی خون تھا اور مسہری کے رنگین بستر پر

خون کا دریا بہہ رہا تھا۔ جاڑیجی جی اور میں دونوں مبہوت کھڑے تھے۔ اُس کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے سکتہ ہو گیا۔ میری نظریں چار ہوئیں اور اُس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "امراجی تم نے مجھے بیوہ کر دیا"۔

"ہرگز نہیں"۔ میں نے کہا "ہرگز نہیں، میں تمہارے سامنے موجود ہوں۔ تم میری ہو اور میں تمہارا ہوں۔ جبر اور دباؤ سے شادی نہیں ہوتی۔ کونباوت کے برہمنوں کے اشلوک پڑھ دینے یا ہون کر دینے سے شادی نہیں ہوا کرتی۔ لہٰذا تم بیوہ نہیں ہو"۔

جاڑیجی نے کہا "نہیں تم غلط کہتے ہو۔ مجھے کونباوت سے نہ کبھی محبت تھی اور نہ ہو سکتی تھی اور یہ بھی تسلیم ہے کہ میری شادی زبردستی کی گئی۔ مگر میں یہ ہرگز نہیں کہہ سکتی کہ کونباوت مر گیا اور میں بیوہ نہیں ہوئی۔ میں تم سے محبت کرتی تھی اور چونکہ وہ محبت لافانی تھی لہٰذا اب بھی بدستور ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ میں کونباوت کی بیوہ نہیں اور اُس کی لاش کے ساتھ نہ جل مروں"۔

میں نے گھبرا کر کہا "یہ نہیں ہو سکتا"۔

اُس نے کہا "امراجی یہی ہو گا اور میں تمہیں اپنی لازوال محبت کا واسطہ دیکر کہتی ہوں کہ تم یہاں سے چلے جاؤ اور مجھے ایک سچی راجپوتنی کی طرح کونباوت کی

لاش کے ساتھ جل مرنے دو۔ تم جاؤ۔ یہاں سے جلدی جاؤ۔ ورنہ مجھے اندیشہ ہے کہ تمہاری جان خطرے میں پڑ جائے گی۔"

میں نے کہا۔ "کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ میں تمہارے بعد بھی زندہ رہ سکوں گا۔"

جاڑیچی جی نے کہا۔ "میں جانتی ہوں کہ دنیا کے پردے پر اس وقت مجھ سے محبت کرنے والا تم سے زیادہ کوئی نہیں ہے اور یہی میری تمنا ہے کہ میرے لئے میری محبت میں تم برسوں بیتاب ہو کر مچھلی کی طرح تڑپتے رہو تاکہ میری روح کو راحت پہنچتی رہے۔ کیونکہ میرے خیال میں میرے لئے اب صرف یہی امر باعث تسکین ہو سکتا ہے کہ میرے عشق میں تم ساری عمر جلتے رہو۔ لہٰذا اب تم جاؤ یہاں سے اور مجھ سے وعدہ کرو کہ مجھے کبھی نہ بھولو گے اور مجھے یاد کرنے کے لئے عرصہ دراز تک زندہ رہو گے۔ بس جاؤ اب جاؤ..... جاؤ جلدی جاؤ..... جاؤ!" جاڑیچی کی آواز بھرا گئی۔ مگر میں کیسے جاتا۔

"تم جاؤ!" اس نے پھر کہا۔ "تم جاؤ..... جاؤ....." اور یہ کہتے کہتے اس کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا۔ اس نے اپنے داہنے ہاتھ کی کلائی سے اپنی آنکھیں چھپا لیں اور روتی ہوئی جھٹکے کھاتی ہوئی آواز سے کہا۔ "..... جا..... ؤ....."

چشم زدن میں میں بھی رو رہا تھا وہ بھی رو رہی تھی اور بائیں ہاتھ سے مجھے

ڈھکیل رہی تھی۔ میں کشاں کشاں نکالا جا رہا تھا۔ رکنا چاہتا تھا مگر رک نہ سکتا تھا وہ مجھے ڈھکیلتی چلی گئی اور پشت کی طرف زینہ تھا اُس کے پاس لیجا کر مجھے کھڑا کر دیا۔ اپنے آنسو پونچھے اور کہا۔ "امراجی تم جاؤ۔"

ان الفاظ میں ایک زور تھا۔ میں نے آخری نظر اُس پر ڈالی اور کہا جاتا ہوں۔ اُس نے ہاتھ سے پھر جھک کر اشارہ کیا اور میں زینے کی تاریکی میں ڈوب گیا۔

دوسرے ہی دن جاڈیچی جی کوتیاونت کی خونی لاش کے ساتھ جل مری۔ جب وہ ستی ہونے جا رہی تھی میں نے دور سے چھپ کر دیکھا۔ نظارہ ناقابل دید تھا۔ میں نے سچ مچ اُس کی چال کے ساتھ راجپوتی حسن و جلال کو جنبش میں دیکھا۔ پھر نہ دیکھ سکا اور سر پکڑ کر بیٹھ گیا لیکن طبیعت نہ مانی اور پھر بیتاب ہو کر دوڑا۔

آخری نظارہ ہولناک تھا۔ ایک دہکتا ہوا تارہ تھا جو برہمنوں کے اشلوکوں اور ناقوسوں اور باجوں کی آوازوں کے مدوجزر پر چمکتا ہوا چتا پر پہونچا۔۔۔۔ آگ ایسی خوبصورت چیز کو جلانے سے انکار کر رہی تھی۔ چتا اندر سلگ رہی تھی اور جاڈیچی جی دھوئیں سے گھٹی جاتی تھی۔ دھوئیں کو وہ ہاتھ سے پریشان کر رہی تھی۔۔۔۔۔۔۔!

دھوئیں کے مرغولے کس قدر اُس کے لئے تکلیف دہ تھے۔ بھبکے کے بھبکے اُس

کے حسین اور خوبصورت چہرے کی طرف بڑھ کر اُس کی آنکھیں پھوڑ رہے تھے کہ دُھوئیں کی سیاہی میں اُس کا چہرہ چھپ گیا۔ گویا چاند سیاہ بدلی میں تھا۔ میں نے بیتاب ہو کر دل میں کہا ع ہم سے تم ایسے چھُپی ہو جیسے چاند چھُپے اندھیری بدلی" وہ بادلوں میں چھُپی ہی تھی کہ...... الامان.... ایک خوفناک "بھَقلے" کے ساتھ جو گرج سے مشابہ تھی ایکدم سے آگ بھڑک اٹھی۔ دھواں غائب تھا اور اُس کا چاند سا چہرہ چمکا ہی تھا کہ شعلوں نے ایک خوفناک جھپٹ کے ساتھ اُس کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنی آتشیں چادر میں لپیٹ لیا۔ یہ معلوم ہوا کہ جیسے دہکتے انگاروں پر کسی نے خوبصورت تتلی ڈال دی۔ تھرتھرا کر اور کانپ کر رہ گئی۔ اور چشم زدن میں جاڑیچی کا تن نازنین ایک سُلگتی ہوئی بھیانک لاش تھا میری ایکدم سے آنکھیں چڑھ گئیں اور میں بادلوں کی طرح ایک سمت دوڑا چلا گیا۔

جاڑیچی فنا ہو گئی مگر اُس نے نہ تو یہ بتایا کہ کونیاوت کا قاتل کون تھا اور نہ یہ بتایا کہ قتل کس طرح ہوا۔

(۵)

دو روز تک میں نے کچھ نہ کھایا نہ پیا۔ جاڑیچی کی لازوال محبت کا دریا تھا

کہ میں اُس میں ڈوب کر رہ گیا۔ لیکن افسوس صد افسوس۔ حیف ہے جارٹیجی کے حسن و جوانی پر کہ جارٹیجی کے عشق و محبت کی میں نے ذرا پروا نہ کی اور چشم زدن میں اُس کی نامراد جوانی اور سچے عشق و محبت کی پاک یاد کو نہ صرف دل سے مٹا دیا بلکہ سچ پچ لفظ "محبت" کو میں نے جوتوں سے روند ڈالا۔

میں نے متاثر ہو کر حیرت سے پوچھا "وہ کیسے؟ حالانکہ میں نے آپ کی زبانی اس نامراد کا قصہ سُنا ہے مگر میں سچ عرض کرتا ہوں کہ جارٹیجی جی کی عجیب غریب محبت کی داستان میرے دل سے کبھی محو نہ ہو گی پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ نے اس کو بھلا دیا......"

"ہاں نہیں نہیں۔ بھلا نہیں دیا بلکہ اُس کی محبت کو پامال کر ڈالا اور پھر اُس کی....." سادھو نے کچھ کہتے کہتے زبان روک لی اور پھر رُک کر کہا۔ لو اب سُنو کہ میں نے کس طرح جارٹیجی جی کی محبت کا خون کیا۔

بائی شری بھٹیانی جی[1]

"میں نے تمہیں نہیں بتایا کہ میں کہاں کا رہنے والا ہوں۔ ٹھکانہ لوسمو
کے موضع گانوڑی کا بیٹر بتایا امر سنگھ راٹھور تمہارے سامنے بیٹھا ہے۔ معلوم
وہ گاؤں ہے کہ مٹ گیا۔"
میں نے کہا "ہے میں جانتا ہوں۔"
"اچھا۔ تو اسی گاؤں کا رہنے والا ہوں اور وہاں سے کچھ فاصلہ
پر موضع سجان گڑھ ہے۔"
میں نے کہا میں سجان گڑھ کو بھی جانتا ہوں بلکہ وہاں تو کئی دفعہ گیا

---

[1] راجپوتوں کی قوم بھاٹی۔

بھی ہوں"۔

سادھو نے کہا۔ "میرا ایک جگری دوست میٹر تیاجنجار سنگھ تھا۔ بسو جب سے میں دیوانہ وار اپنے گاؤں بھاگا اور یہاں جنجار سنگھ کی صحبت نے بہت کچھ غم غلط کر دیا۔ جنجار سنگھ بڑا زندہ دل اور رنچلا میٹر تیا تھا اور ہمیشہ میرے پاس ساتھ رہنے لگا۔ گو میرا دل دنیا کی کسی چیز میں نہ لگتا تھا اور ہر وقت جاڑیچی جی کی غمناک و حسین صورت سامنے رہتی تھی، لیکن جنجار سنگھ کی زندہ دلی کم از کم ایک وقتی دلبستگی بن کر سکون پیدا کر دیتی تھی۔

جاڑیچی جی کو بھسم ہوئے چوتھا مہینہ چلتا تھا کہ ایک روز کا ذکر ہے کہ ہم دونوں شکار کو گئے۔ ہم دونوں گھوڑوں پر تھے اور ہمارا داروغہ (غلام) اونٹ پر تھا۔ شکار وغیرہ تو ملا نہیں اور ہم لوٹنے والے ہی تھے کہ کیا دیکھتے ہیں کہ دو اونٹ چلے آ رہے ہیں۔ آگے کے اونٹ پر ایک راجپوت بیٹھا تھا۔ پیچھے کے اونٹ پر دو پردہ پوش عورتیں بیٹھی تھیں اور ان کے ساتھ ایک آدمی تھا جو داروغہ معلوم ہوتا تھا۔

آہ! وہ بھی کیا زمانہ تھا۔ راجپوتوں کو اس میں مزہ آتا تھا کہ راستہ چلتے خوامخواہ کسی سے جھگڑ پڑیں۔ یا زیر کر کے اُس کا مال و اسباب چھین لیں یا

ڈاکہ نہیں تھا بلکہ خوشی کا سودا تھا جس کا جی چاہے ہماری سوائی[1] مان لے اور ہاتھ جوڑ کر مزے میں چلا جائے ورنہ ہم سے لڑے۔ مارے یا مرے۔

جنجار سنگھ نے اونٹوں کو دیکھتے ہی کہا۔ "آہا ہا! چلو ان سے سوائی منوائیں۔ کہنے کی دیر تھی کہ گھوڑوں کو ہم نے مہمیز کیا اور تلواریں سونت کر اونٹوں کا راستہ کاٹ کر کھڑے ہو گئے۔

یہ دیکھتے ہی آگے والے اونٹ پر سے تڑپ کر راجپوت نیچے کو کودا اور کڑک کر اس نے ہماری گستاخی کی وجہ پوچھی۔ ہم نے بتا دیا کہ ہم سوائی منوانے آئے ہیں۔

یہ سن کر اس نے پوچھا تم کون ہو؟

میں نے جواب دیا۔ "بیٹر تیا۔"

جنجار سنگھ نے اس کو چھیڑنے کی غرض سے کہا۔ "بیٹر تیوں کی سوائی مان لینے میں توہین نہیں ہوتی۔"

راجپوت نے طنز سے سر کو جنبش دیکر کہا۔ "متھانیہ[2] کے چوہان تو نے نہیں دیکھے ہوں گے۔" عورتوں والے اونٹ کی طرف اس نے انگلی اٹھا کر کہا۔ "راجا پتھور کی

---

[1] یعنی تم سیر ہو ہم سوا سیر اور تم سے بھاری ہیں۔ [2] جودھپور کا ایک چھوٹا سا گاؤں

ٹھکرانی بہری بہن چوہانی جی اور اُس کی لڑکی ہے۔ اور کیا بہتر نہ ہو کہ ایک چوہانی تمہیں جوتیاں مار کے بھگا دے۔ کل کے لونڈے چوہانوں سے سوانی ہنوانے آئے ہیں۔" یہ کہہ کر ہم دونوں کی طرف حقارت سے دیکھ کر اپنا کھانڈا میان میں رکھنے لگا۔

میں نے کہا۔ "ٹھاکراں ۔۔۔۔ یہ کھانڈا اکیلا کہے گا؟ اس کو میان میں کیا بغیر خون چیلے یونہی رکھو گے! ابیٹر تیتروں کا خون تھا۔ یہ ایسے کھانڈے ہی کو ملتا ہے معلوم ہوتا ہے تمہارے کھانڈے نے اب تک بھیل یا بنیوں[1] ہی کا خون چکھا ہے ..... لے آپ نکالو سیدھی طرح کھانڈا اپنا ورنہ ہم لیے جاتے ہیں چوہانی جی کو۔"

یہ سنتے ہی بھائی تو سبھائی خود بہن یعنی چوہانی اونٹ پر سے للکاری:۔

"ہے ٹھاکراں[2]! ..... مجھے تو دے سروہی!" اپنے داروغہ سے بولی اور للکار کر کہا۔ "جھکا دے[3] اونٹ"

---

[1] بانی بھی بھیلوں کی طرح جنگلی مگر ارذل قوم ہے۔

[2] مارواڑی زبان میں اظہار کیلئے جب صیغہ جمع بولتے ہیں تو مراد احترام اور عزت ہوتی ہے۔

[3] بٹھا دے۔

اندر اونٹ کے جھٹکے جھٹکے چوہان نے داروغہ کے کمر پٹکے سے سروہی سونت لی اور پوری راجپوتی شان سے پردے کو خیر باد کہا۔ چادر سے خوبصورت چہرہ نکلا اور ایک طرف کاندھے سے چادر سرک کر نیچے آ گئی اور اونٹ پر سے بیٹھے ہی بیٹھے اُس نے دونوں پیر ایک طرف کئے۔ اور ہم دونوں کو چیلنج کیا اور اپنے بھائی کو ڈپٹا جو کھانڈے سے ہمارے اوپر حملہ کرنے کو تھا۔

مگر میں تو اب کسی اور ہی طرف متوجہ تھا۔ ٹھکرانی کی خوبصورت نوجوان لڑکی جو اُن کے آگے بیٹھی تھی ایک دلربا سادگی کے ساتھ اپنی ماں کے کندھے کی طرف سے مُنہ پر سے چادر ہٹائے دیکھنے لگی اور میں اس کے ملکوتی حسن سے متاثر ہو کر اُدھر دیکھنے لگا۔

ہم نے ٹھکرانی صاحب کے ہاتھ جوڑ کر کہا: "ماتا جی ہم آپ سے نہیں لڑتے۔ نہ ہم آپ سے سوانی منواتے ہیں۔ ہم تو آپ کے بھائی سے سوانی منواتے ہیں۔"

یہ کہہ کر میں نے اپنی تلوار نیام سے کھینچی اور چوہان کی طرف بڑھ کر ڈپٹ کر کہا: "چھوڑ دے اپنا کھانڈا...... ڈال دے کھانڈا۔ سوانی میری ہے۔"

چوہان نے پھرتی سے اپنا کھانڈا کھینچا اور دو ہتڑ تان کر پینترا بدل کر کھڑا ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ اس خوفناک کھانڈے کی باڑھ میں بھلا کوئی بھی آتا تو دو ہو جاتے۔

لہٰذا میں نے بائیں ہاتھ سے زمین پر سے ریت اُٹھائی اور داہنے ہاتھ میں تلوار سنبھالتے ہوئے چوہان کے مُنہ پر پھینکنا شروع کی یہ کہہ کر کہ "بول میری سوائی" ...... مان میری سوائی"۔

چوہان آگ بگولا ہو گیا اور اُس نے ایک دم سے گویا اُڑ کر ایک زور کی جھپٹ کے ساتھ اس زور سے کھانڈے کا وہ ہاتھ دیا ہے کہ اگر بچا نہ جاؤں تو دو ہو جاؤں۔ میں نے تڑپ کر کھانڈا خالی دیا اور اس صفائی سے تلوار چکائی کہ بھرپور ہاتھ چوہان کے داہنے شانے پر پڑا۔ خون کا فوارہ نکلا۔ چوہان کے ہاتھ سے کھانڈا چھوٹ گیا۔ میں نے تلوار بلند کر کے نعرہ مارا۔ "رنڑ بنکا راٹھور[1] ..... بول سوائی ہیٹر تیا کی ......" یہ کہہ کر میں چوہانی کے داروغہ کی طرف لپکا۔

چوہانی جی کا داروغہ سہم گیا اور میری تلوار کی چمک سے وہ بول اُٹھا۔ "سوائی ہے ہیٹر تیا ...... سرداراں زخمی[2] ......"

ایک تو بھائی کا زخمی ہو کر گرنا اور دوسرے داروغہ کا ہماری سوائی مان لینا۔ چوہانی نے غضبناک شیرنی کی طرح شکست کی چوٹ سے بیتاب ہو کر

---

۱ راٹھوڑوں کا قومی نعرہ یعنی راٹھوڑ ران کا بانکا ہے

۲ بمعنی کی۔

سمجھا اور ٹھکرانی کی طرف ہاتھ جوڑ کر جے شری ماتا" کہکر کہا کہ "بیبک[51] کرتے ہیں" اور یہ کہہ کر ہیں اپنے شکست خوردہ دشمن کا کھانڈہ لینے جھکا۔ فتح کی نشانی دشمن کی تلوار ہوتی ہے ٹھکرانی اپنے بھائی کو چھوڑ کر چیخ کر اٹھی اور کھانڈا اپنے قبضہ میں کرکے ہمیں ایک ڈپٹ دی کہ بھاگو۔ ہم نے کہا کہ جانے دو کھانڈا اور "بیبک" کی ہے دوبارہ کہ ایکدم سے سامنے سے گرد وغبار کا طوفان اور "جودھوں[52]" کے جنگی نعروں کی آواز آئی۔ سر اٹھا کر جو دیکھتے ہیں تو چھ سوار چلے آرہے ہیں۔ ٹھکرانی کا چہرہ فق ہوگیا۔ بھائی کی تیمارداری چھوڑ کر اس نے ماتھا اپنا پیٹ لیا۔ اپنی خوبصورت لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر جھپٹ کر اپنے اونٹ کے پاس آئی کہ اتنے میں سوار قریب ہی آگئے۔ ان کا سردار بھاری بھرکم آدمی کوئی ۳۵ برس کی عمر۔ قوی ہیکل سیاہ فام۔ بانکی پگڑی سر پر۔ کان میں مندرے لٹکے۔ اس نے شاید ہمیں چوہانی جی کا آدمی سمجھا۔ اور کڑک کر بولا۔ "مان سوئی جودھوں کی...... لاؤ میری بھٹیانی" یہ کہہ کر اس نے دوشیزہ کی طرف اس طرح گھور کر دیکھا کہ میرے تن بدن میں آگ ہی تو لگ گئی۔ نظریں کہہ رہی تھیں کہ کیا معاملہ ہے لڑکی کو لینا چاہتا ہے یہ معلوم ہوگیا کہ یہ ان لوگوں کو جانتا ہے نیز یہ کہ چوہانی جی

[51] یہ اجازت دیجئے۔
[52] جودھانی کی اولاد راٹھوروں کی شاخ ہے۔

ایک چیخ کے ساتھ خود اپنے داروغہ پر سروہی کا وار کر دیا کہ اس نے کیوں ہماری سفارش مان لی۔ اور چاندنی سمٹتی ہوئی۔ سروہی ہاتھ میں خوں فشاں نظروں سے ہمیں دیکھتی ہوئی اپنے بھائی کی طرف چلی۔ جو زخم کے صدمہ سے بیہوش پڑا تھا۔ چوہانی کی ماہ پیکر صاحبزادی صاحبہ بھی ماں کے ساتھ ماموں کی تیمارداری کو بڑھیں۔ میں تو اس شعلۂ حسن کی جنبشوں کو دیکھ کر مبہوت سا ہو کر رہ گیا۔ ماں بیٹیاں قریب پہنچیں اور چوہانی نے بھائی کا زخم دیکھتے ہوئے اپنے داروغہ کو آواز دی کہ پانی کی چھاگل لائے۔ اُس غریب کی پشت میں سروہی کا اوچھا سا زخم لگا تھا۔ وہ اُس کی دیکھ بھال میں مشغول تھا۔ میں نے دوڑ کر اونٹ پر سے چھاگل کھولی اور لا کر چوہانی جی کو دی۔

مغرور ٹھکرانی نے تیور بدل کر چھاگل لی مگر جل کر کہا۔ "ٹھاکراں تم یہاں سے جاؤ۔ ہٹو پرے۔"

ہم دونوں ذرا ہٹ آئے اور ہم نے دیکھا کہ ماں بیٹیوں نے کپڑے ہٹا کر زخم کھولا۔ دونوں کے خوبصورت ہاتھ خون میں لال ہو گئے۔ ابھی ہم دونوں اس پارۂ حسن کو دیکھ رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ ٹھکرانی کو یہ نظارہ بازی پسند نہ تھی اور اُس نے ایک جھڑک کر ہم سے جانے کو کہا۔ ہم نے اب ٹھہرنا مناسب نہ

کے ٹھاکر بھائی ہیں۔

ٹھکرانی نے گھبرائی ہوئی آواز سے اُس سے کہا۔ "خیریت چاہتا ہے تو لوٹ جا۔" اپنی بیٹی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "تجھے یہ زمانہ نہیں مل سکتی۔"

میں نے کڑک کر کہا۔ "تم کون ہو؟"

خوفناک جودھے نے کہا۔ "ابے چھوکرے لاؤنون[1] کے جودھوں کو نہیں جانتا۔ (دوشیزہ کی طرف انگلی اٹھا کر) یہ میری ہے۔ تو کون ہے؟ داروغہ ہے چھاتی جی کا؟"

بس یہ کہنا تھا کہ غضب ہو گیا۔ جنجار سنگھ کا اور میرا اس طعنہ پر راجپوتی خون کھول گیا۔ میں نے اپنے داروغہ کو گالی دے کر کہا۔ "لاؤ تو میرا کھانڈا۔" اور پھر ہم دونوں نے اس خوفناک جودھے کی طرف دانت پیس کر کہا۔ "جودھوں کے داروغہ ذرا ٹھہر تو جا۔"

چھاتی کا داروغہ ہمیں ہمت بڑھانے کو بولا "جے سوائی ٹھری ہیڑیاں ری۔"

اُدھر اس خونی جودھے نے جنبش کی کہ ٹھکرانی نے جھٹ سے اپنی خوبصورت

---

[1] لاؤنون تعظیمی ٹھکانہ جودھپور ہے۔

لڑکی کے ہاتھ سے کنگن اُتار کر سامنے ریت پر پھینک دیا۔ اور ہماری طرف دیکھ کر جوش میں پکار رہی "اے میڑ تیا بھاٹیوں کا کنگن۔ دیکھوں تو سہی بھاٹیوں کا کنگن جودھوں جودھوں سے کیسے جیتتا ہے۔ اس کنگن کی اور میڑتیوں کے کھانڈے کی لاج آج تو تیرے ہاتھ ہے (لڑکی کا ننگا ہاتھ اونچا کر کے بولی) یہ بھٹیانی تیری ہے۔ دیکھتا کیا ہے سامنے کنگن پڑا اُٹھا کر پہنا دے۔"

اب خود سوچیے کہ میرا کیا حال ہوا ہوگا۔ دوشیزہ بھٹیانی سے جو میری آنکھ ملی ہے تو اُس کی خوبصورت آنکھوں نے کہا۔ یا کہ میں تیری لونڈی ہوں میرا ننگا ہاتھ ہے اس میں کنگن پہنا دے۔

میں تیزی سے کنگن کی طرف بڑھا۔

جودھا نے للکار کر کہا۔ "او دروغے! خبردار! کنگن میرا ہے" یہ کہہ کر اپنے گھوڑے پر سے کود پڑا۔ اور کھانڈا لے کر آگے بڑھا میں نے اپنا کھانڈا پیچھے پھینکا اور اپنے دروغے سے ڈھال لی اور کٹھوری "اونا" چمکا کے آگے بڑھا۔"

دیوپیکر جودھا نے پینترا بدل کر اپنا کھانڈا تولا اور آگے بڑھ کر کتنا شروع کیا۔

۵۱ یہ نہایت ہلکی تلوار ہے جو سروہی سے بھی زیادہ دھار دار ہوتی ہے۔

چشم زدن میں گزر کی طرح اُس نے میرے سر پر کھانڈے کا وار کیا۔ میں نے کھانڈا ڈھال پر لیا اور جھاڑ دے ساتھ کمال بڑی پھرتی سے اپنا اونا چمکایا۔ مگر جودھا بچ گیا۔ دونوں پیچھے ہٹے۔ جودھا سمجھ گیا کہ اِس پھرتیلے راجپوت کے خلاف کھانڈا کام نہیں دے گا۔ لہذا اُس نے کھانڈا پھینک کر اپنی تلوار سونتی۔ اُس کے داروغہ نے لپک کر کھانڈا اُٹھالا اور ڈھال ہاتھ میں دیدی اور اب جودھا نے میرے اوپر وار کرنے شروع کئے۔ مہلت نہ دی۔ ہر پینترہ پر جودھے کا قدم آگے تھا اور میں پیچھے ہٹنے پر مجبور تھا۔ جودھا کا تیغا تڑپ تڑپ کر میری ڈھال پر گر رہا تھا۔ ہر وار پر معلوم ہوتا کہ میرے دو ہو جائیں گے مگر ڈھال موقع پر پہونچ جاتی۔ اُس وقت اُس حسین دوشیزہ کا عجیب حال تھا۔ خوبصورت ہونٹ حیرت اور استعجاب سے ذرا کھلے ہوئے۔ اُس کو خبر بھی نہیں کہ چادر سرک کر کاندھے سے گر چکی ہے اور چاند سا چہرہ کُھلا ہوا ہے۔ وہ تو جنگ کی کشمکش دیکھ رہی تھی۔ تلوار کی ہر ضرب پر اُس کے خوبصورت اور حسین چہرے کے ذرات حسن لرز جاتے تھے۔

جودھا نے میرے سر پر ضربوں کی بارش کر دی تھی۔ جھنا جھن۔ جھاجھن جودھا کی تلوار میری ڈھال پر تڑپ تڑپ گر رہی تھی۔

دیکھتے ہی دیکھتے جودھا کے پہلے حملہ کا زور شور تھکتا معلوم ہوا۔ ضربات کی برق

رفتار ہی ذرا ہلکی پڑی۔ میرا پیچھے ہٹنا ذرا کم ہوا۔ کہ جودھا نے گھبرا کر ایک وار
جو کیا ہے تو گو اُوچھا پڑا۔ مگر پگڑی کاٹ کر تلوار میرے سر پر زخم دے گئی اور
چشم زدن میں میرے سر سے بہہ کر خون چہرے پر آنے لگا۔ میں نے دیکھا کہ نوجوان
بھٹیانی کا چہرہ رنج و غم سے لرز کر رہ گیا۔ مگر نہیں۔ میرے بدن میں کافی خون تھا
اور پھر جوان اور مضبوط بھی تھا۔ اور میری ہمت اور قوت میں ذرا فرق نہ آیا۔ گو میں
برابر مدافعانہ جنگ کر رہا تھا۔ مُنہ پر سے خون آتا وہ کندھے سے اپنے پوچھتا جاتا تھا
مگر جودھا کا خوفناک تیغا بستور تڑپ تڑپ کر میرے سر پر گر رہا تھا کہ اتنے میں
جودھا کا دوسرا وار میرے کندھے پر لگا۔ مگر ڈھال پر سے اُوچٹ کر لگا۔
لہذا اوچھا پڑا۔ مگر تلوار گوشت میں ضرور گھس گئی۔ اب مجھے ڈر لگا کہ کہیں مار نہ کھا جاؤں
دوشیزہ اور اس کی ماں کی حالت قابل رحم تھی۔

مگر خوفناک جودھا بھی شل ہو گیا تھا۔ مسلسل تلوار چلانا آسان نہیں ہے۔
ایک لمحہ کا اُس کو آرام نہ ملا تھا۔ اُس کو نہیں معلوم تھا کہ میں اسکو تھکا دوں گا۔
اور دراصل وہ اب ہانپ رہا تھا۔ میں دراصل باوجود اپنے زخموں کے تازہ دم تھا۔
جودھا کے ہاتھ میں سستی آگئی اس کی ضرب ایک گونہ ہلکی۔ آہستہ [illegible]
پڑ رہی تھی اور جودھا نے اب دیکھ لیا کہ اگر اور کچھ دیر یہی حا

کہ اٹھانا دشوار ہو گا۔ غالباً یہی سوچ کر اور اپنی شکست سے ڈر کر اب اُس نے اور چال چلی۔

میں نے اب ہنسنا بند کر دیا تھا اور چٹان کی طرح ڈٹا کھڑا تھا کہ جودھا نے ایک دم سے نعرہ مار کر ایک زبردست وار کیا اور ساتھ ہی اچھل کر اپنی ڈھال کی اوجھڑ میرے منہ پر ماری۔ جودھا کی ڈھال کے بیچوں بیچ میں ایک بالشت بھر کا برچھا لگا ہوا تھا کہ بچانے اور مارنے دونوں کام میں آسکے۔

میں نے وار کو تو ڈھال پر کاٹا اور ڈھال کی اوجھڑ سے بچنے کو پیچھے اُڑا اور اڑتے ہی میں نے جودھا کے بائیں شانہ پر ایسا جنیو کا ہاتھ دیا کہ اُونا جودھا کی اپسلی پر جا کر رُکا۔ جودھا کے ہاتھ سے ڈھال اور تلوار گری اور گرتے گرتے میں نے اُونے سے ایک طمانچہ کا ہاتھ جو دیا ہے تو رخسارہ کاٹتا ہوا اُونا جا کر جودھا کے دوسرے گال کی ہڈی پر بولا۔

بے ساختہ دونوں ماں بیٹیوں کے منہ سے نکلا۔

"جے سوائی منری میٹر تیارے کھانڈہ ادی"

میں نے نعرہ مارا۔ "رنتر سنبکار اٹھور" اور دیوانہ وار دوڑ کر اُونا پھینک کر اپنا کھانڈا لیا اور اُس میں لنگش پر وکر ناچنے لگا۔ جودھوں میں سے کسی کی ہمت نہ تھی جو

آگے بڑھتا۔

"جے شری ہیٹر تیارے کھانٹا رہی"۔ جنجار سنگھ نے نعرہ مارا۔

میں نے اپنا کھانڈا الیند۔ کیا جو کنگن پہنے ہوئے تھا۔ جنجار سنگھ دوڑ کر چوہانی جی کے پاس آیا۔ اور دوشیزہ کا داھنا ہاتھ پکڑ کر اُس نے کھینچا اور مجھے آواز دی۔ دوشیزہ شرمائی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ میں اکڑتا مسکراتا بھمیانی کے پاس پہونچا۔ اُس نے میری طرف محبت بھری نگاہوں سے دیکھا اور میں نے پھرتی سے اپنے کھانڈے میں سے کنگن نکال کر اپنی محبوبہ کے نازک اور خوبصورت ہاتھ میں پہنا دیا۔ اور اُس کا ہاتھ اُٹھا کر احترام سے اپنی آنکھوں سے لگا کر آہستہ سے چھوڑ دیا۔ اور چھوڑتے ہی کھانڈا لیکر ہم دونوں گھوم کر اس طرف متوجہ ہوئے اور للکار کر ہم نے دشمن سواروں سے کہا:۔

"بول سوائی شری ہیٹر تیاں دی"

ہم چار آدمی تھے۔ دونوں ہم اور دو ہالے دروغہ۔ اور پانچویں ٹھکرانی چوہانی جی جن کے ہاتھ میں سروہی تھی۔

دشمن نے ہماری سوائی نہ مانی اور ہم دونوں لپکے اپنے گھوڑوں کی طرف اور دروغہ کو آواز دی کہ لانا برچھی۔

مگر جودھوں کی ہمت پست تھی غالباً ان میں سپاہی اور داروغہ تھے سب کے سب دُم دباکر بھاگے اور ہم نے اپنے جے کاروں سے ریگستان سر پر اُٹھا لیا۔

"وجے سوانی شری میٹر تیاں رے کھانڈاری"

(۷)

اِس شعلۂ نوجوان بھٹیانی نے دم کے دم میں مجھے دیوانہ کر دیا۔ ڈبو کر رکھ دیا۔ کہاں کی جاڑیچی جی اور کیسی جاڑیچی جی۔ موہنی صورت چمکتے ہوئے "داونے" کی طرح دل میں گھپ کر رہ گئی ...... جاڑیچی کی محبت پامال کر ڈالی! ..... حیف صد حیف۔ راجپوت بھی کیسا ظالم ہوتا ہے ......"

اتنا کہہ کر سادھو ذرا دیر کے لئے خاموش ہو گیا۔ اُس کی حالت قابلِ رحم تھی۔ میں نے بھی خاموش رہنا بہتر سمجھا کہ وہ خود ہی بولا:

"...... جاڑیچی جی بیشک راجپوتنی حسن و خوبصورتی کا بہترین نمونہ تھی لیکن بھٹیانی اور ہی چیز تھی۔ میں کیا کہوں ویسی شکل شاید ایک ہزار برس میں راجپوتانہ پیش نہ کر سکے گا۔ قصہ مختصر صورت شکل تھی اُس کی کہ حسن کی تصویر جس کی نظریں اپنے محبوب سردار کے کلیجہ میں اُتر جاتی تھیں۔ جودھا نے جو اپنی ڈھال کی برچھی

کا ہولا دیا تھا وہ میری ٹھوڑی کے نیچے لگا۔ بہت خفیف سا زخم تھا۔ میرا زخم بھی کچھ زیادہ نہ تھا۔ اب سب سے پہلے تو ٹھکرانی نے اپنے بھائی کی مرہم پٹی کی۔ اُن کا نام رام سنگھ چوہان تھا۔ چوہانی کے ریشمی دوپٹے اور رومالوں کو جلا کر زخم میں رکھا گیا۔ رام سنگھ جی کو ہوش آ گیا تھا مگر نقاہت تھی۔ میرے سر میں بھی زخم بھر دیا گیا اور کسا۔ مجھے پر پٹی یا کپڑا باندھ دیا گیا۔

ٹھکرانی نے مجھ سے کہا۔ "آج میٹریتوں کے کھانڈے نے بھائیوں کا کنگن جیت دیا ہے راٹھور۔" یہ (اپنی بیٹی کی طرف اشارہ کر کے) بھٹیانی اب تیری اور تیرے کھانڈے کی چیری ہے۔ تو جان اور تیرے کھانڈے کی کمائی۔ جی چاہے ابھی اپنی جیتی ہوئی کمائی اپنے گھوڑے پر بٹھا کر گھر لے جا اور جی چاہے میرے گھر چل اور دیکھ کہ راجا بشیور کی ٹھکرانی اپنی بیٹی کو کیا دائجا (دہیز یعنی جہیز) دیتی ہے۔ یہ سنتے ہی مارے خوشی کے میری جان کھنچنے لگی۔ دل میں محبت کا درد سا ہونے لگا اور میں خوشی کے لہجہ میں بولا۔ مجھے "دائجا پھائجا" کچھ نہیں چاہئے۔ مجھے تو میری بھٹیانی دیدو۔"

۱؎ محبت کا لفظ ۲؎ ہاندی لونڈی

یہ کہہ کر میں نے نوجوان بھٹیانی کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔ نوجوان دوشیزہ نے شرما کر اپنی ماں کی چادر کو پکڑا اور جگہ سے نہ ہلی۔ مارے شرم کے گری جانے لگی۔ میں نے ہنس کر کہا۔ "لئے جاتا ہوں اپنی بھٹیانی رانی"۔ اور یہ کہہ کر میں نے گود میں لیکر پھول کی طرح اپنی بھٹیانی کو اٹھا کر اپنے گھوڑے پر بٹھا دیا۔ نوجوان دوشیزہ منہ چھپا کر رونے لگی اور ٹھکرانی کی آنکھیں بھی تر ہو گئیں۔ جیجار سنگھ نے گھوڑا ٹھکرانی کے قریب کر دیا۔ ماں بیٹی کو دلاسا دینے لگی۔ اور پچکار کر سمجھانے لگی۔

میری تو یہی مرضی تھی کہ اپنی دلہن کو لے کر ابھی لوٹ جاؤں کہ ٹھکرانی کچھ متفکر سی ہو گئی اور اندیشہ ظاہر کیا کہ راجلدیشور تک زخمی بھائی کو لے جانا نہ صرف مشکل ہو گا بلکہ جودھوں کے حملے کا خطرہ بھی ہو گا۔ یہ جودھا جو مارا گیا ٹھکرانی کا بڑا زبردست دشمن تھا۔ لہٰذا یہ بات طے ہوئی کہ ہم دونوں راجلدیشور چلیں ٹھکرانی اور بھی خوش تھی کہ اپنی لڑکی کو ٹھاٹ کیساتھ رخصت کر سکے گی۔

میں نے مقتول کا کھانڈا اپنے داروغہ اور ڈھال وغیرہ اور زیور جو کچھ بھی تھا ٹھکرانی کے داروغہ کو انعام میں دیدیا۔

(۸)

چوتھے روز ہم راجلدیشور پہونچے اور فوراً طے کیا کہ میری دلہن رخصت

کر دی جائے۔

الغرض شادی کی محفل گرم ہوئی بھاٹیوں کے چارن[51] اور بھاٹ چنگ لے کر آ گئے۔ بھاٹیوں اور مٹبر تیوں کی تلواروں کے افسانے چنگ پر اڑنے لگے۔ بھاٹی دو آتشہ کے جام پی پی کر جھومنے لگے۔ جلسہ عین رنگ پر آیا ہی دولھا بنا بیٹھا تھا اور پھیرنے پڑنے والے ہی تھے کہ میٹرنہ[52] سے میری بہن کا درو غہ ایک ایسی سنا ونی لایا کہ بس غضب ہی ہو گیا۔

وہ خبر وحشت اثر یہ تھی کہ جے پور کے کچھواؤں اور مرہٹوں کے دل نے میٹرنہ لوٹ لیا۔ قصبہ میں آگ دبا دی اور راٹھوڑنیوں کو چن چن کر ٹکے بیچ ڈالا اور خود میری بہن ٹکے[53] میں بک گئی۔

---

[51] راجپوتوں کے قومی شاعر۔

[52] جودھپور کا پرانا قصبہ جو میٹرتیوں کے نام سے موسوم ہے۔

[53] ٹکے میں بکنے سے مطلب یہ ہے کہ قصبہ فتح کر کے باہر یہ اعلان تمام راٹھوڑنیوں کو شہر کے باہر بلوالیا۔ کسی کی عزت نہیں جاتی تھی بس نام چادر کو اپنے قبضہ میں کر لیا اور شہر میں ڈھنڈورا پٹوا دیا کہ راٹھوڑنیاں ٹکے ٹکے نیلام ہوتی ہیں ہلو لینے۔ چنانچہ خود عورتوں کے (باقی صفحہ ۶۰ پر دیکھیے)

خدا کی پناہ! کیسی رنج فرسا اور لرزا دینے والی خبر تھی۔ ارے غصہ کے میرا منہ لال ہو گیا۔ بھائیوں کی بھری محفل میں میری ناک کٹی۔ جوشِ غضب سے دیوانہ ہو کر میں اٹھ کھڑا ہوا۔ بسم اللہ کی قسم کھائی اور فوراً میں نے اور چغتا نے گھس کے اپنے اپنے کھانڈوں کے نیام توڑ ڈالے کالا بھات کھانڈے تو کچھ ڈر کر اور مرید کے بدن میں رہ گئے۔ میں نے اپنا کھانڈا دامن پر گاؤ تکیہ سے لگا کر بطور اپنے قائم مقام[۲] کے رکھ دیا۔ گلے سے ہار اور سر سے سہرا اتار کر اپنے کھانڈے کو پہنا دیا اور کہا کہ میں اپنی بہن کی مدد کو جاتا ہوں میری جگہ یہ میرا کھانڈا ہے۔

(صفحہ ۵۸ سے آگے) رشتہ دار جا کر ننھی عورت اکیلا نکال کے چھڑا لاتے تھے۔ یہ نہیں ہوتا تھا کہ کسی عورت کو کوئی دوسرا آدمی لے جائے صرف گھر کے مرد اپنی عورتوں کو چھڑا لاتے تھے یہ کار روائی محض توہین کی غرض سے کی جاتی تھی اور اس کا عام رواج تھا۔

۲ کھانڈے کے پھیرے سے بھی شادی ہو جاتی ہے پہلے زمانے میں اکثر دولہا اپنی بجائے اپنا کھانڈا دلہن کے گھر بھیج دیا تھا اور کھانڈا دولہا کی طرح مسند پر رکھا جاتا تھا اور پالکی میں بھی دولہا کی طرح جاتا تھا اور دلہن کھانڈے کے ساتھ رخصت ہو جاتی تھی۔ بہت جگہ اب بھی یہی دستور ہے۔

دلہن اس کے ساتھ پھیرے کھالے گی اور اپنے سسر اور ساس سے اس نے اجازت چاہی۔

قصہ مختصر میں اور جنجار سنگھ دونوں کے دونوں فوراً کے فوراً اپنی بہنوں کی عزت کا بدلہ لینے کی قسم کھا کر شادی کی محفل سے جانے کے لئے تیار ہو گئے۔

مگر ایک عظیم الشان وقت بھی ہے جس نے مجھے گویا چلتے چلتے لمحہ بھر کے لئے روک لیا۔ جنگ پر جاتا ہوں، نہ معلوم لوٹوں یا نہ لوٹوں۔ کم سے کم اپنی بھٹیانی کو تو ایک دفعہ اور دیکھ لوں۔ چنانچہ جنجار سنگھ کے ذریعہ سے میں نے خفیہ طور پر اپنی اس خواہش کو اپنی ساس چوہانی جی پر ظاہر کر دیا۔ چوہانی جی نے میری التجا منظور کر لی اور نہ بھی کیوں کرتیں۔ اُنہوں نے تو مجھے میرے کھانڈے کی کمائی فوراً کے فوراً ہی سونپ دی تھی۔

آہستہ سے میں کمرے کے دروازے پر پہنچا۔ پردے کو ہاتھ سے ہٹایا ہی تھا کہ کیا دیکھتا ہوں کہ کمرہ روشنی میں چمک رہا ہے اور ایک خوبصورت سہری پر بھٹیانی نگینے کی طرح بڑی چمک رہی تھی۔ پردہ اُٹھاتے ہی اُس نے میری طرف دیکھا اور اس کے چہرے پر ایک مسکراہٹ سی آئی پھر میرے دل پر ایک بجلی کوند کر

گری۔ ایک وارفتگی کے عالم میں بیتاب ہوکر میں لپکا اور اپنی خوبصورت بھٹیانی کو پچ مچ کلیجہ سے چمٹا لیا اور ....!

خدا کی پناہ عورت ایک پُرفسوں مگر خاموش اور دلکش راگنی ہے جس کی ہر جُنبش ایک دل وزتان ہے۔ بھٹیانی نے اپنی پوری سحر کارانہ قوت کے ساتھ انتہائی محبت سے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا نہیں بلکہ واقعہ یہ تھا کہ تار نظر کے ذریعہ مع اپنی ہوش رُبا طاقتوں کے میرے دل میں اُتر گئی۔ آہ! میرے دل میں جوش محبت سے درد سا ہوتا معلوم دیا' ایسا کہ سچ مُچ میرا سانس تیزی سے چلنے لگا اور میں نے درد محبت کی ٹیس سے بیتاب ہوکر آہستہ سے بھٹیانی کو اپنے کلیجہ سے ذرا علیحدہ کیا۔

بھٹیانی نے شرم سے اپنی محبت آمیز نظریں نیچی کرلیں اور میں نے دیکھا کہ عشق و محبت کا نور کس طرح اُس کے حسین اور پرفسوں چہرے کی چاندنی پر غلطاں ہے۔

بھٹیانی نے پھر اپنے سردار کو ایک نظر دیکھا اور پھر آہستہ سے آنکھیں نیچی کرلیں۔ میں نے مختصر سی باتیں کیں۔ بھٹیانی نے چند الفاظ میں اُن کا جواب دیا۔ ہر جواب محبت کی ایک طولانی داستان تھا۔ یہ واقعہ تھا کہ اگر بھٹیانی نے

اپنی محبت کے جادو سے دیوانہ کر دیا تھا تو میں نے بھی اُس کے تن بدن میں آگ پھونک رکھی تھی۔

وقت کم تھا اور ہم دونوں جب ا ہوئے۔ میں نے پھر ططیا کو گلے سے لگا لیا اور سچ مچ اُسکو ماہی بے آب کی طرح تڑپتا چھوڑا۔

باہر جو نکلا ہوں تو میری عجیب حالت تھی۔ جنجار سنگھ میرا منتظر ہی تھا۔ ہم دونوں نے فوراً ہی اپنے گھوڑے لیے اور روانہ ہو گئے

جو دروغہ پیغام لایا تھا اُس کی زبانی یہ معلوم ہوا کہ وہ میٹریوں کا جنگی دھون کھاٹو[1] کے کانکڑہ کی طرف گرجتا چھوڑ کر آیا ہے لہٰذا ہم دونوں نے بھی کھاٹو کا رُخ کیا۔

جب ہم ہیرا اوتی کے کانکرہ دنگل یا میدان پہونچے ہیں تو ہمیں اپنے جنگی دھونسے کی پہلی گرج سُنائی دی۔ اس گرج کے سُنتے ہی ہم دونوں کے منہ سے بیساختہ اپنا جنگی نعرہ نکلا۔

---

[1] مارواڑ کا ایک گاؤں۔

"زنڈربکارا اٹھو!"

دھونسے کی پہلی ہی گرج پر بقول کسے میڑتیا اپنی دلہن چھوڑ کر دھونسے کی طرف دوڑتا ہے۔

تیسرے ہی دن ہم اپنے لشکر سے کھاٹو سے آگے جا ملے۔ ہمارا لشکر اسیہ ہاڈگانے[1] کی طرف جا رہا تھا، جہاں دوسرے روز دشمنوں سے ہماری پہلی ٹکر ہوئی۔

دشمن کے لشکر کو ہم نے چشم زدن میں پاش پاش کر دیا اور اب ہمارا دھونسہ خونی دیوں کی طرح گرجتا میڑتیوں کو چہار طرف سے اپنی جنگی آواز کے ساتھ کھینچتا میڑتہ کی طرف لئے جا رہا تھا۔

میڑتہ کے خونی کانکڑ پر ہمارا لشکر مرہٹوں اور کچھواہوں کے جم غفیر سے ٹکرایا۔ اور ڈھائی گھنٹہ کی انتہا سے زیادہ گھمسان اور خوفناک مسلسل جنگ کے بعد ہم نے دشمن کو سخت شکست دی۔ اور کھیرے ککڑی کی طرح کاٹ کر دھر دئے۔ اور خونی میدان پر ہم اور ہمارے بھائی میڑتیے دشمنوں کے خون میں نہاتے اپنے خونچکاں کھانڈوں کو بلند کئے دشمنوں کے لاشوں کو حقارت سے روندتے

[1] جو دھپور ریلوے اسٹیشن بھی ہے۔

اور ہمارا جنگی دھوں نہ ایک فتحمند۔ اور خون آشام دیو کی طرح اس خونی میدان جنگ میں گرج رہا تھا۔

(۹)

لڑائی کے بعد ہم دونوں صرف دو روز میٹرتہ میں ٹھہرے اپنی بھٹیانی سے ملنے کا شوق اس فتح سے اور بھی زیادہ ہوگیا۔ لہذا جلد ہی پہونچنے کے لئے ہم نے اپنے گھوڑے یہیں سے چھوڑے اور ایک تیز رفتار سانڈنی کو لیکر ہم دونوں ہوا کی طرح میٹرتہ سے نکل گئے۔

فراق یار میں میرا برا حال تھا۔ دن و رات منزلیں مارتے ہم راجلدیشور کی طرف اڑے چلے جارہے تھے ایک ناقابل بیان قوت تھی جو مجھے راجلدیشور کی طرف کشاں کشاں بجلی کی تیزی سے لئے جارہی تھی جب میں سوجان گڈھ پہونچا ہوں تو رات کے دو بجے ہوں گے اور ہم نے یہاں تھوڑا آرام لینے کی ٹھہرائی ایک جان پہچان دوست کے یہاں ہم سو گئے۔ اور یہاں میں نے پھر وہی خواب دیکھا۔

"کیا دیکھتا ہوں کہ عجیب نور کا عالم ہے۔ ایک بقعۂ نور سا جنبش میں آتا ہے

اُس میں سے بھٹیانی کا چہرہ اپنی تمام حُسن آرائیوں اور جلوہ آرائیوں کے ساتھ نمودار ہوتا ہے۔ ایک عشق تاباں ہے کہ حُسن لرزاں متبسّم و متزلزل! کہ ایکدم چہرے پر ملکوتی سنجیدگی آتی ہے۔ جو میرے دیکھتے ہی دیکھتے ایکدم سے جلال حُسن کی صورت بن جاتی ہے۔ ایک حُسن برہم ہے کہ حُسن جلالی کا نورانی پیکر۔ مجھ سے آنکھیں چار ہوتی ہیں۔ میرے مُنہ سے نکلتا ہے "بھٹیانی" اور "یہ طلسم سامری کا" وہ اپنا ہاتھ اُٹھاتی ہے۔ کلمہ کی اُنگلی بلند ہوتی ہے اور ایکدم سے اُنگلی شمع کافوری کی طرح مشتعل ہو جاتی ہے۔ خدا کی پناہ! اُنگلی کی عجیب و غریب نورانی روشنی سے بھٹیانی کا چہرہ تمتما اُٹھتا ہے بلکہ بھڑک اُٹھتا ہے۔ میں پوچھتا ہوں۔ "یہ کیا؟" ایک عجیب انداز سے بھٹیانی جواب دیتی ہے۔ "اے میرے سورما یہ تمہاری ہی محبت کی ابتدا ہے"...... ایک چیخ کے ساتھ میری آنکھ کھل جاتی ہے کہ جبار سنگھ بھی جاگ اُٹھا ہم فوراً روانہ ہو گئے۔ پو پھٹ رہی تھی اور ہماری سانڈنی وسیع میدان کی ریت میں ہوائی جہاز کی طرح اُڑی چلی جا رہی تھی!

ہم جلد از جلد راجا پتور پہونچے۔ میں نے اپنے خواب کا حال جبار سنگھ سے بھی نہیں بیان کیا تھا۔

ہماری سانڈنی ٹھیک میری سسرال کے پھاٹک پر رکی اور اے میرے عزیز میں تجھ سے اب کیا کہوں کہ ہم نے وہاں کیا دیکھا! جس وقت ہم پہنچے دوپہر کا وقت تھا۔ اور جو کچھ بھی وہاں پہونچکر ہم نے دیکھا یا سنا وہ بیان سے باہر ہے! گھر ماتم کدہ بنا ہوا تھا اور ہم پہونچے ہیں تو جو بھی وہاں موجود تھا اس پر بجلی گر گئی۔ کیا یہ سب کچھ ممکن تھا؟ مگر ہاں واقعہ تو واقعہ ہی تھا! حیف صد حیف"

یہاں پہونچکر ضعیف العمر سادھو کی آواز بھرا گئی۔ اس کی خشک آنکھوں میں نمی سی معلوم دی اور وہ رک گیا۔ اس نے مجھ سے پانی کو اشارہ کیا۔ سامنے کی دیوار کی طرف اس نے اشارہ کر کے مجھ سے ایک پتھر ہٹانے کو کہا۔ میں سمجھ گیا۔ میں نے پانی پینے کا کنٹول لیا اور پتھر کو یہ سمجھ کر ہٹایا کہ یہاں کوئی گھڑا دکھا ہوگا لیکن میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے پتھر کو ہٹایا تو روشنی نمودار ہوئی اور اندر جنگل سا نظر پڑا۔ سامنے کوئی ڈیڑھ فٹ چوڑا پہاڑی چشمہ تھا جو تیزی سے بہہ رہا تھا۔ میں اندر داخل ہوا تو حیرت و استعجاب کی حد نہ رہی۔ کوئی سو گز کا لمبا چوڑا چھوٹا سا جنگل تھا جو چاروں طرف نہایت ہی بلند پہاڑیوں سے گھرا ہوا تھا۔ نہ صرف اس کی زمین میں بلکہ ہر چہار طرف دیواروں اور ٹیلوں میں صدہا درخت تھے جہاں امرود اور شریفہ اور لگرونددی کے درختوں کا جنگل کا جنگل تھا۔

توپ کے گولے کی طرح ہم دونوں مجمع چیر کر دھکیلتے ہوئے پہونچے تو کیا دیکھتے کہ نور کے سانچے میں ڈھالی اور میری وفادار بیوی بھٹیانی آگ کے بیچوں بیچ میں بیٹھی ہے اور ہمارے دیکھتے ہی ایک دم سے وہ شعلوں میں لپٹ گئی۔

میں نے بھٹیانی کو دیکھا اور اس نے مجھکو...... کیسے؟ ہم دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں۔ میں نے غم سے چھاتی پیٹ لی اور سینے سے میرے ایک غم کی چیخ نکلی کہ کڑا! اور اُدھر بھٹیانی کے محبت بھرے سینے سے ایک دلدوز چیخ نکلی ہے کہ چمکیلا تیغا! ایک بھنّاٹا سا ہوا...... اور عالم کائنات کے کٹ کر دو ہو گئے! بھٹیانی نے تڑپ کر شعلوں سے نکلنے کی کوشش کی...... مگر بیکار اُس کا آدھا جسم جل رہا تھا...... وہیں کی وہیں تڑپ کر میری طرف دیکھتی رہ گئی اور دہشت اور مصیبت کی شدّت سے ایک دم سے اُس کا چہرہ خوفناک اور بھیانک ہو گیا مجھ سے امداد کے لئے اُس نے وحشت زدہ آنکھیں پھاڑ کر اور کڑک کر اور دلدوز چیخ لگانا چاہی تھی کہ شعلوں نے اس زور سے اُس کے معصوم اور نازک رُخسار پر آگ کے خوفناک تھپیڑ لگائے کہ گال کی چمڑی اُدھڑ کر گر پڑی اور اُس کا بدن وہیں تھرا کر رہ گیا چشم زدن میں آگ کا ایک جہنم تھا کہ جو تیزی سے بھڑک رہا تھا اور میں کودنے کی میں ناکام کوشش کر رہا تھا۔ میری آنکھیں بند

ہو گئیں۔ اور میں بیہوش ہو کر گر گیا۔

اس کے بعد کتنے دن تک میں دیوانہ وار گھومتا رہا اور کوئی قوت تھی جو مجھے اس جگہ لائی۔ مجھے ہوش آیا سمت ۱۸۱۵ کی تاریخ مہا چیت بدی چھٹ تھی۔ میں ہوش میں تھا اور میں نے آگ کو کوسا اور قسم کھائی :-

تو را ناں پا نہیں کھاؤ ساں لے وا سد بو ن تہ
ما ڈیٹھاں تو بالیاں بھٹیانی جی رد تہ

آج پونے دو سو برس ہونے آئے میں نے کوئی آگ کی پکی ہوئی چیز نہیں کھائی مگر آج تک بھٹیانی جی کی محبت کی آگ میں برابر جل رہا ہوں اور جاڑیچی جی اور بھٹیانی جی کی پاک اور مقدس روحیں آج پونے دو سو برس سے سوانہ کی خاموش اور تاریک گپھاؤں میں گھومتی رہتی ہیں۔ اور جب رات آتی ہے تو میرے سامنے دونوں کی دونوں اپنی اپنی چتاؤں پر بیٹھ کر آجاتی ہیں اور یہ خوفناک ڈرامہ برابر جب سے روزانہ رات کو میرے سامنے ہوتا آرہا ہے۔

ا۔ اے بے غیرت واسدیو یعنی آگ میں اب کبھی تیرا پکایا ہوا نہیں کھاؤں گا (غضب ہے کہ) تو نے میرے دیکھتے دیکھتے بھٹیانی جی کی ہڈیاں جلا دیں۔

اور یہی راز ہے میری اس مُردہ زندگی کی طوالت کا، مگر اب میرے گناہوں کی شاید تلافی ہو چکی۔ اے میرے اجنبی عزیز وہ مٹی اور وہ لاش میں ہی ہوں۔ مجھے جلانا مت اور جس چشمے سے پانی لائے ہو اسی میں مجھے لٹا دینا۔۔۔۔۔۔

جے ہو شری جاڑیچی جی کی
جے ہو شری بھپانی جی کی

خدا حافظ۔"

سادھو کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی اور وہ مُردہ تھا۔ میں نے جلدی سے سادھو کی وصیت کی تعمیل کی اور جس قدر جلد ہو سکا غار سے نکل کر نیچے پہونچا۔

سورج ڈوب رہا تھا اور میں نے مڑ کر دیکھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ وہی سفید بلّی میری طرف دیکھ رہی ہے۔ میں نے قدم تیز کئے اور چراغ جلے اپنی جائے قیام پر تھا۔

(۱۰)

اب جس سے کہتا ہوں وہ یہی کہتا ہے کہ بھول کر بھی کبھی سوانہ کی گپھاؤں کی طرف نہ جانا ورنہ اب کی زندہ لوٹنا مشکل ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ مقامی

تخیل تھا اور کوئی کہتا ہے کہ ضرور تم نے کوئی خواب دیکھا ہے اور میں کہتا ہوں کہ واقعہ اور خواب میں فرق ہے اور جہانتک میں غور کرتا ہوں یہ خواب نہیں تھا۔ واللہ اعلم۔

ختم شد

پرنٹر و پبلیشر
محمد احید الدین ایف۔ آر۔ ایس۔ ای۔ لندن
مطبوعہ نظامی پریس بدایوں

ملنے کا پتہ

نظامی بک ایجنسی بدایوں (یوپی)